وجودیت اور اردو شاعری: معاصر اردو غزل میں فرد کی آزادی کا تصور

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

محمد بن افتخار احمد

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۲ء

وجودیت اور اردو شاعری: معاصر اردو غزل میں فرد کی آزادی کا تصور

مقالہ نگار:

محمد بن افتخار احمد

یہ مقالہ

ایم فل اردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگو یجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۲ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: وجودیت اور اردو شاعری: معاصر اردو غزل میں فرد کی آزادی کا تصور

پیش کار: محمد بن افتخار احمد، رجسٹریشن نمبر:4Mphil/Urd/S20

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اردو زبان و ادب)

ڈاکٹر ظفر احمد ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

بریگیڈیر سید نادر علی ____________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: ____________

اقرار نامہ

میں، محمد بن افتخار احمد حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد کے ایم فل اُردو اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ظفر احمد کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد بن افتخار احمد

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۲ء

فہرست

مقالے اور دفاع کی منظوری کا فارم

اقرار نامہ

فہرستِ ابواب

Abstract

اظہارِ تشکر

باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

ا۔ تمہید	01
i. موضوع کا تعارف	01
ii. بیان مسئلہ	02
iii. مقاصدِ تحقیق	02
iv. تحقیقی سوالات	03
v. نظری دائرہ کار	03
vi. تحقیقی طریقہ کار	05
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	06
viii. تحدید	06
ix. پس منظری مطالعہ	07
x. تحقیق کی اہمیت	07
ب۔ وجودیت (تعارف و نظری مباحث)	08
i. فرد کی آزادی	17
ii. فرد کی آزادی کے عناصر	19

iii. وجودی مفکرین کی آرااور فرد کی آزادی کی اہمیت 24
ج۔ معاصراردوغزل گوشعراء 27
حوالہ جات 36
باب دوم: منتخب معاصراردوغزل گوشعراکے ہاں آزادیِ انتخاب اور سوچ کے عناصر
ا۔ فرد کی آزادی اور آزادیِ انتخاب 40
ب۔ فرد بحیثیت قانون سازاور ماورائیت کا مرکز 55
ج۔ انفرادیت اور اجتماعیت کا امتزاج 65
د۔ داخلی کائنات و باطن کی اہمیت 73
حوالہ جات 82
باب سوم: منتخب معاصراردوغزل گوشعراکے ہاں آزادیِ عمل کے عناصر
ا۔ فرد کی آزادی اور آزادیِ عمل 88
ب۔ وجود جوہر پر مقدم ہے 97
ج۔ اعلیٰ مقاصد کی جستجو 105
د۔ فرد کی آزادی اور مزاحمت 113
حوالہ جات 123
باب چہارم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج وسفارشات
ا۔ مجموعی جائزہ 129
ب۔ تحقیقی نتائج 132
ج۔ سفارشات 134
کتابیات 136

Abstract

The struggle of existence is eternal and will remain forever. The philosophical movement of existentialism lightens the complication and deepness about the human existence with full details. Existentialism is a western movement which started in 19th century in Denmark. Later on, it came up as a complete philosophy because of the writings and thoughts of French and German thinkers. Individual freedom has always been the most important subject. Philosophical movement of existentialism extremely emphasizes on individual's freedom and liberty. In this research, Jean-Paul Sartre's lecture "Existentialism is a Humanism" has the status of basic philosophy. In addition, it is an element of existentialism that all existential thinkers agree on.

In this thesis, an analytical study of the ghazals of selected contemporary Urdu ghazal poets, Mir Ahmad Navaid, Sabir Zafar, Qamar Raza Shahzad and Akhter Usman, has been done with reference to the concept of freedom of the individual. Which is the basic and most important element of existentialism. Selected poets have prominent place in contemporary Urdu ghazal. Poets are selected in terms of subject matter that have a clear tendency for individual freedom. In this thesis, only those poets are selected who have discussed individual freedom as major and most important subject matter.

The chapters of this thesis include the introduction of the subject of research and basic discussions, elements of freedom of choice and thougt, elements of the freedom of action in contemporary Urdu Ghazal and overall review, results and recommendations. With the completion of this research work, we conclude that existentialism has the most

basic and important value in the freedom of the individual. The concept of individual freedom is expressed with all the details in the chosen poets work. Contemporary Urdu Ghazal should also be studied in the context of new existentialism, According to Colin Wilson, Sartre frequently discusses freedom and what he will do with it when the world is meaningless.Like Europe, we have a metaphysical interpretation and a atheistic interpretation of existentialism. The two schools must be studied independently and compared in order to determine the dominant existentialist tendency. Despite the fact that much effort has been made in this study to link the idea of freedom with the philosophy of action and responsibility, further research is still needed. In order to determine if freedom is unfettered or responsible, modern poets should be studied with reference to the philosophy of responsibility with the concept of freedom.

اظہارِ تشکر

تشکر کی منزل ایک خوبصورت احساس ہے۔ میرے تعلیمی سفر کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت سے احباب میرا حوصلہ رہے۔ جن کا شکریہ ہر آتے جاتے سانس کے ساتھ بھی ادا کیا جائے تو کم ہے۔

سب سے پہلے میرے تحقیقی مقالے کے نگران، مشفق و مہرباں، ڈاکٹر ظفر احمد کا انتہائی ممنون ہوں کہ وہ تحقیق کے دوران ہر مرحلے میں حد درجہ معاون و مددگار رہے۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز کا شکریہ کہ جس کی بدولت ایم۔اے اور ایم فل دونوں سطحوں پر ایسے اساتذہ میسر آئے جو لفظ کی حرمت اور روح سے آشنا ہیں۔ جنھوں نے لفظ کو اپنی زندگیاں دی ہیں۔

کردار جو بند ہیں لفظوں میں مشکل سے کہانی کھولتے ہیں

اک عمر جوان کے ساتھ رہیں تب جا کے معانی کھولتے ہیں

ڈاکٹر فوزیہ اسلم (صدر شعبہ اردو)، ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر بشریٰ پروین، ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر نازیہ ملک، ڈاکٹر ارشاد بیگم، ڈاکٹر صنوبر الطاف، اور مادام انجم مبین سے بے شمار سیکھنے کو ملا۔ جس کے لیے تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

سردار محمد اسلم (سابق چیف جسٹس) اور ان کے صاحبزادے پیارے دوست، بیرسٹر سردار تیمور اسلم، وائس ایڈمرل جنرل محمد شفیق (سابق ریکٹر بحریہ یونیورسٹی) اور محمد زیفور کا بہت احسان مند ہوں کہ انھوں نے ایم۔اے میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کے بعد تعلیمی سفر منقطع کیے بغیر ایم فل کی ترغیب دلائی اور ہمیشہ ڈھارس بندھاتے رہے۔

کہوٹہ کے شعری حلقے سے جاوید احمد، حبیب گوہر، حسن ظہیر راجا، حسن فرزوق، عدنان نصیر اور حسیب علی کا بھی بہت شکریہ کہ وہ یہاں محبت کی فضا قائم کیے ہوئے ہیں۔

چند شاعر ہیں جو اس شہر میں مل بیٹھتے ہیں

ورنہ لوگوں میں وہ نفرت ہے کہ دل بیٹھتے ہیں

آخر میں اپنے بچوں جیسے چھوٹے بھائیوں اور خدا صفات امی کا بہت شکریہ کہ ان کی دعائیں ہر دم گھیرے رکھتی ہیں۔ حق تعالی باباجان کو ہمیشہ اپنی بادشاہت میں رکھے۔ عجلت میں جن محبت زادوں کا نام بہ نام ذکر نہیں ہو سکا ان کے لیے بھی ہدیہ تشکر۔

محمد بن افتخار احمد

باب اول

موضوع کا تعارف اور نظری مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف:

عہدِ جدید جہاں اپنے ساتھ جدید اور آسائشوں سے بھرپور طرزِ زندگی لے کر آیا وہیں پہ جدید ترین مسائل کا سبب بھی بنا ہے۔ عصر حاضر کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کی وجہ سے سماجی سطح پر بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یہ تبدیلیاں اس قدر سنجیدہ نوعیت کی ہیں کہ انسان وجودی سطح پر مستقل قسم کے شکوک وشبہات کا شکار ہو رہا ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہے کہ اس کا وجود اس کائنات میں غیر معمولی اور انقلابی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ وجود اصل میں کیا ہے؟ اور اسے دن بدن رونما ہونے والی پر اثر تبدیلیوں کے باوجود کیوں کر اصل اور خالص شکل میں برقرار رکھا جائے۔ اس طرح کے بے شمار سوالات سماجی اور معاشرتی سطح پر تغیرات کی وجہ سے شدید اور بااثر انداز میں پیدا ہو رہے ہیں۔ انسانی وجود سے متعلق ایسی ہر طرح کی پیچیدگی اور گھمبیرتا کو وجودیت کی فلسفیانہ تحریک تمام تر جزئیات کے ساتھ روشن کرتی ہے۔ وجودیت یعنی Existentialism ایک مغربی تحریک ہے۔ جس کا آغاز انیسویں صدی میں ڈنمارک سے ہوا اور بعد ازاں جرمنی اور فرانس میں دیگر مفکرین کے افکار اور نگارشات کی بدولت ایک واضح فلسفے کے طور پر سامنے آئی۔

ایک ادیب عام لوگوں کی نسبت زندگی اور اس کے متعلقات سے حد درجہ زیادہ جڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے سماج اور اس میں رونما ہوتا معمولی نوعیت کا حامل واقعہ بھی تخلیق کار اور حساس ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت پر تمام شدتوں کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔

اس مقالے میں جن منتخب شعراء کی غزل کا فلسفہ وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان میں صابر ظفر، اختر عثمان، قمر رضا شہزاد اور میر احمد نوید شامل ہیں۔ معاصر اردو غزل گو شعراء کی فہرست خاصی طویل ہے تاہم مجوزہ مقالے میں ان شعراء کا انتخاب کیا گیا ہے جن کے ہاں فرد کی آزادی کا بھرپور میلان ہے۔

منتخب شعراء معاصر اردو غزل میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔اس مقالے کے بنیادی ماخذات میں صابر ظفر کے شعری مجموعات "آتش بیگانگی"، "جمال آب سے وصال، "دیوار پہ چاک سے لکھاہوں"، "آواز کی لہر پر چلا میں "اور "روح قدیم کی قسم"،اختر عثمان کے شعری مجموعات "کچھ بچالائے ہیں"، "ابدتاب "اور "چراغ زار "قمر رضاشہزاد کے شعری مجموعات "ہاراہوا عشق "، "پیاس بھرا مشکیزہ"، "یاددہانی"، "خامشی"، "بارگاہ "اور "شش جہات "اور میر احمد نوید کے شعری مجموعات "وجود"، "موجود "اور "ہاں اور نہیں کے درمیاں "شامل ہیں۔

۲۔بیان مسئلہ:

انسانی وجود عجیب طرح کا طلسماتی اور سمجھ میں نہ آنے والا مدعا ہے۔وجود کی کشمکش ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔غزل اردو کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔جس طرح غزل نے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کیا اور ہر دور سے ہم آہنگ ہو کے نئے سے نئے موضوعات کو اپنے اندر جگہ دی وہ قابل ستائش ہے۔معاصر اردو غزل کے منتخب شعراء کے ہاں وجودیت اور اس کے تمام تر متعلقات اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ موجود ہیں۔وجودیت اور وجودی مفکرین کے ہاں فرد کی آزادی انتہائی اہم اور بنیادی موضوع ہے۔یہ ایسا نکتہ ہے جس پر تمام وجودی مفکرین کے ہاں اتفاق ہے۔عصر حاضر میں سائنسی اور تکنیکی ترقی کی وجہ سے فرد وجودی سطح پر جدید مسائل سے دوچار ہوا ہے۔آج کا دور کارپوریٹ سیکٹر کا دور ہے۔جس کی اثر پذیری ہر آنے والے دن کے ساتھ شدت اختیار کر رہی ہے۔ہر آنے والے دن کے ساتھ فرد کی انفرادیت سکڑ کر اجتماعیت کا روپ دھار رہی ہے۔ایسے میں وجودیت ایسی فکر ہے جس کی بنیاد ہی فرد کی آزادی اور انفرادیت پر ہے۔وجودیت کے حوالے سے تحقیقی کام کا جائزہ لیں تو اس سے قنوطی پہلو تو نمایاں ہوتے ہیں لیکن فرد کی آزادی جیسا رومانوی پہلو روشن نہیں ہوتا یوں اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وجودیت کو اس زاویے سے بھی دیکھا جائے۔آزادی کی اہمیت مسلمہ ہے آزادی سے بڑھ کر رومانویت کہیں اور نہیں۔لہذا اس تحقیقی مقالے میں وجودیت کے اس مخصوص زاویے کے حوالے سے معاصر اردو غزل کے منتخب شعراء کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

۳۔مقاصد تحقیق:

اس تحقیقی مقالے میں درج ذیل تحقیقی مقاصد پیش نظر رہے:

۱۔ وجودیت میں فرد کی آزادی کی اہمیت کو سمجھنا۔

۲۔ معاصر اردو غزل کے منتخب شعراء کے کلام کا فرد کی آزادی کے حوالے سے مطالعہ کرنا۔

۳۔ منتخب شعراء کے ہاں فرد کی آزادی کی مختلف صورتوں کو دریافت کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات:

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی سوالات پیش نظر رہے:

۱۔ وجودیت میں فرد کی آزادی کی کیا اہمیت ہے؟

۲۔ منتخب شعراء کے ہاں فرد کی آزادی کا تصور کس طور بیان ہوا ہے؟

۳۔ منتخب شعراء کے ہاں فرد کی آزادی کے عناصر کو کیسے برتا گیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

وجودیت ایک مغربی تحریک ہے۔ جس کا موضوع فرد کی انفرادی زندگی اور اس کو آزانہ طور پر بسر کرنا ہے۔ فلسفہ وجودیت ہر اس فکر کی پر زور مخالفت کرتا ہے جو انسان کی انفرادیت چھیننے کے درپے ہو۔ وجودیت انفرادی زندگی کو تمام تر شعور، داخلی کیفیات اور جذبات و احسات کے ساتھ بسر کرنے کا نام ہے۔ وجودیت Existentialism کے مغرب دو دبستان ملتے ہیں اول الہیاتی اور دوم الحادی۔ الہیاتی وجودی خدا کے وجود کے قائل ہیں جبکہ الحادی وجودی خدا کے وجود کے منکر ہیں۔ الہیاتی وجودیت میں کرکیگارڈ، یاسپرس، مارسل، بروڈیائیو، اونامنو، بوبر وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ الحادی وجودیت میں سارتر، ہائیڈیگر، کامیو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ الہیاتی وجودی کرکیگارڈ کو اپنا امام تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جوہر وجود پر مقدم ہے۔ جبکہ الحادی وجودی سارتر کو اپنا امام جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک وجود جوہر پر مقدم ہے۔

اردو میں وجودیت کو سمجھنے کے لیے سلطان علی شیدا کی تصنیف "وجودیت پر ایک تنقیدی نظر"، قاضی جاوید کی تصنیف "وجودیت"، ڈاکٹر حیات عامر حسینی کی تصنیف "وجودیت"، "فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ" از ڈاکٹر جمیل اختر محبی، "جدید اردو نظم میں وجودیت" از ڈاکٹر شاہین مفتی، قاضی جاوید (مترجم) کی "وجودیت اور انسان دوستی" وغیرہ اہمیت کی

حامل کتب ہیں۔اس تحقیقی مقالے میں وجودیت کے اہم عنصر فرد کی آزادی کا منتخب شعراء کے شعری مجموعات کے حوالے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔وجودیت کو انسان دوستی کا نام سارتر نے دیا۔سارتر کا کہنا ہے کہ وجودیت ایک ایسا نظریہ ہے جو انسانی زندگی کو ممکن بناتا ہے۔اسی طرح فرد کی آزادی کا تصور بھی سارتر کی تحریروں میں زیادہ روشن اور واضح ملتا ہے۔سارتر کی تحریروں میں تصور آزادی کی ایک ایسی بنیاد ملتی ہے جو زیادہ قابل فہم ہے۔

فرد کی آزادی یا تصور آزادی کے حوالے سے سارتر کا ۱۹۴۵ء کا خطبہ "وجودیت اور انسان دوستی" اہم ہے۔ جس میں سارتر نے فرد کی آزادی کو تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ بھی یہ عنصر وجودیت کا ایسا عنصر ہے جس پر تمام وجودی مفکرین کا اتفاق ہے اور یہ اشتراکات میں شمار ہوتا ہے۔

آج جس دور ہم سانس لے رہے ہیں وہ کارپوریٹ کلچر کا دور ہے۔ عصر حاضر کا بڑا تضاد بہتات اور فراوانی کے باوجود انتہائی صورتوں کی حامل معاشی ناہمواری ہے۔جدید ٹیکنالوجی اور ذرائع پیداوار میں اتنی سکت تو موجود ہے کہ تمام زمیں زادوں کی ضروریات سے کہیں زیادہ پیداوار کی جاسکے لیکن اس کے باوجود فرد وجودی کشمکش سے دوچار ہے اور غربت اور محرومی میں لتھڑا ہوا ہے۔کارپوریٹ کلچر فرد کی آزادی پر ایک بڑی قدغن اور رکاوٹ ہونے کے ساتھ وجودی کشمکش کا سبب ہے۔

کارپوریٹ سیکٹر کی ہر کل و جزپہ اجارہ داری فرد کی آزادی اور اس کے امکانات کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔کارپوریٹ سیکٹر کی اس اجارہ داری نے انفرادیت کو اجتماعیت میں بدل دیا ہے۔کارپوریٹ سیکٹر کی مطلق العنانیت اور کنٹرول اس قدر شدید ہے کہ وہ حالات کا رخ جیسے پھیرنا چاہے پھیر لیتا ہے۔آج کے دور میں قوانین، اقدار اور اخلاقیات کی بنت کاری کارپوریٹ سیکٹر کی منشا اور خواہشات کے مطابق ہوتی ہے۔یہ طبقہ اس قدر طاقت ور ہے کہ فرد کی آزادی کی بیشتر صورتیں اور انفرادیت معدوم ہو گئی ہے۔

فرد کی آزدی کی دو صورتیں ہیں۔اول freedom from اور دوم freedom to، مذکور اصطلاحات کو بالترتیب منفی آزادی اور مثبت آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔منفی آزادی سے مراد ایسی آزادی ہے جس میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں جبکہ مثبت آزادی سے مراد ایسی آزادی ہے جس میں چند بندشیں بھی ہوتی ہیں۔جن میں خودی، مستقل مزاجی، مقصدیت وغیرہ شامل ہیں۔

فرد کی آزادی کے حوالے سے پیاغ بوغدوPierrre Bourdieu نے عادات واطوار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہیبیٹس ’’Habitus‘‘ کا نظریہ پیش کیا۔ جو سماجی علوم پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا۔ اس نظریے کے مطابق سماجی کارندے ایسی حکمت عملی تیار کرتے ہیں جو دنیا اور سماج کو اپنے ڈھانچے میں ڈھالتی ہے۔ ہیبیٹس سے مراد وہ عادات اور طور طریقے ہیں جو شدید طرح سے خمیر کا حصہ بن جاتے ہیں۔ بوغدو کا نظریہ ہے کہ کسی بھی میدان عمل کو لے لیا جائے جیسے معیشت، سیاست، فنون، صحافت، بیوروکریسی، سائنس یا تعلیم بالآخر سماجی تعلقات کے ایک مخصوص کمپلیکس کو جنم دیتا ہے۔ یوں ایک مربوط نظام ہے جس کا چلن معاشرتی سطح پر سماج کا طرہ ہے۔

٦۔ تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ موضوع " وجودیت اور اردو شاعری: معاصر اردو غزل میں فرد کی آزادی " کی اساس تحقیقی ہے۔ جس میں معاصر اردو غزل کے منتخب شعراء کی غزلوں میں وجودیت کے اہم پہلو فرد کی آزادی کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے بنیادی ماخذات میں صابر ظفر کے شعری مجموعات "آتش بیگانگی"، "جمال آب سے وصال، "دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں"، "آواز کی لہر پر چلا میں" اور "روح قدیم کی قسم"، اختر عثمان کے شعری مجموعات "کچھ بچا لائے ہیں"، "ابدتاب" اور "چراغ زار" قمر رضا شہزاد کے شعری مجموعات "ہارا ہوا عشق"، "پیاس بھرا مشکیزہ"، "یاددہانی"، "خامشی"، "بارگاہ" اور "شش جہات" اور میر احمد نوید کے شعری مجموعات "وجود"، "موجود" اور "ہاں اور نہیں کے درمیاں" شامل ہیں۔ اسی اعتبار سے سب سے پہلے بنیادی ماخذات یعنی شعری مجموعات میں موجود بنیادی مواد کی جانچ پڑتال کے بعد موضوع کے متعلق اشعار تلاش کیے گئے ہیں۔ جن کا فرد کی آزادی کے عناصر کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ موضوع کے متعلق مواد کے حصول کے لیے ادبی و تحقیقی رسائل و جرائد واخبارات کے ادبی ایڈیشن مثلاً "ارژنگ"، "تخلیق"، "جسارت"، "فانوس"، "خیابان"، "قرطاس ادب" وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ چونکہ مقالے میں معاصر اردو غزل کے منتخب شعراء کے شعری مجموعات کو فرد کی آزادی کے تناظر میں دیکھنا مقصود تھا۔ اس لیے تاریخی و دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں وجودیت کے حوالے سے تصنیف شدہ، ترجمہ شدہ، مرتب شدہ کتب، مقالہ جات اور مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف لائبریریوں جن میں

نیشنل لائبریری، ادارہ فروغ قومی زبان کی لائبریری، نذیر لائبریری نمل، ذاتی لائبریریاں، گوگل اور ریختہ جیسی اہم ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق:

منتخب شعراء اور فرد کی آزادی کے حوالے سے جامعاتی سطح پر کسی قسم کا تحقیقی کام نہیں ہوا۔ منتخب شعراء کی غزلوں کو فرد کی آزادی کے حوالے سے پرکھنا بالکل منفرد اور نیا کام ہے۔ وجودیت کی تفہیم کے لیے مواد تراجم، مضامین اور تصانیف کی صورت میں میسر ہے۔ مجوزہ موضوع کے قریب ترین موضوعات جن پر جامعاتی سطح پر تحقیقی کام ہوا درج ذیل ہیں:

ا۔ مجید امجد کی شاعری اور فلسفہ وجودیت، مقالہ برائے ایم۔ فل، مقالہ نگار: افتخار بیگ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۵

۲۔ بیسویں صدی کی اردو شاعری پر وجودیت کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، مقالہ نگار: افتخار بیگ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۹

۳۔ اقبال اور وجودیت، مقالہ برائے ایم۔ فل، مقالہ نگار: ناہید گل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

اس تحقیقی کام کے باوجود وجودیت کی ذیل میں فرد کی آزادی کے حوالے سے تحقیقی کام کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس تحقیقی مقالے میں منتخب شعراء کی غزلیات کا فرد کی آزادی کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جو اپنے آپ میں جدید اور نیا کام ہے۔

۸۔ تحدید:

اس مقالے میں جن منتخب شعراء کی غزل کا فلسفہ وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے حوالے سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان میں صابر ظفر، اختر عثمان، قمر رضا شہزاد اور میر احمد نوید شامل ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ایسے شعراء کا انتخاب کیا گیا ہے جن کے ہاں فرد کی آزادی کا ایک واضح رجحان موجود ہے۔ معاصر اردو غزل میں بہت سے نامور اور نئے لکھنے والے شعراء موجود ہیں جن کے ہاں کہیں کہیں فرد کی آزادی کے متعلق اشعار مل جاتے ہیں تاہم اس انتخاب میں

صرف انھیں شعراء کو منتخب کیا گیا ہے جن کے ہاں فرد کی آزادی ایک بڑے اور اہم ترین موضوع کی حیثیت رکھتی ہے۔ منتخب شعراء کے ہاں روایتی رنگ میں نظمیہ انداز میں فرد کی آزادی کے حوالے سے مسلسل غزلیں ایک بڑے موضوع کی صورت میں موجود ہیں۔ معاصر اردو غزل میں منتخب شعراء ایسے شعراء ہیں جن کے ہاں اجتماع کے مقابلے انفراد کا ذکر تمام تر شدتوں کے ساتھ موجود ہے۔ منتخب شعراء میں سے صابر ظفر کے تمام شعری مجموعات موضوع کا حصہ نہیں ہیں ان کے تازہ ترین مجموعات اس مقالے کا حصہ ہیں۔ جن میں فرد کی آزادی نسبتاً زیادہ موجود ہے۔ تحقیقی مقالے کو ضبط تحریر میں لانے کے دوران میں کلی سروکار غزلیات اور موضوع کے متعلق اشعار سے کیا گیا ہے۔اس مقالے کے بنیادی ماخذات میں صابر ظفر کے شعری مجموعات "آتش بیگانگی"، "جمال آب سے وصال، "دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں"، "آواز کی لہر پر چلا میں "اور "روح قدیم کی قسم" ، اختر عثمان کے شعری مجموعات "کچھ بچا لائے ہیں"، "ابدتاب" اور "چراغ زار" قمر رضا شہزاد کے شعری مجموعات "ہارا ہوا عشق"، "پیاس بھرا مشکیزہ"، "یاددہانی"، "خامشی"، "بارگاہ" اور "شش جہات" اور میر احمد نوید کے شعری مجموعات "وجود"، "موجود" اور "ہاں اور نہیں کے درمیاں" شامل ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

اردو زبان وادب میں وجودیت کی تفہیم کے لیے مواد مضامین، تراجم اور تصانیف کی صورت میں موجود ہے۔ سلطان علی شیدا کی تصنیف "وجودیت پر ایک تنقیدی نظر" مجموعی طور پر وجودیت اور اس کے تعارف پر مشتمل ہے۔ قاضی جاوید کی تصنیف "وجودیت" ہے جس میں انھوں نے چند اہم وجودی مفکرین کی سوانح اور ان کی فکر کو موضوع بنایا ہے۔ قاضی جاوید کا ہی ترجمہ شدہ سارتر کا خطبہ "وجودیت اور انسان دوستی" اس حوالے سے اہم ہے۔ڈاکٹر جمیل اختر محبی کی تصنیف "فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ"، ڈاکٹر شاہین مفتی کی "جدید اردو نظم میں وجودیت"، ڈاکٹر اقبال آفاقی کی تصنیف "مابعد جدیدت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں"، ڈاکٹر حیات عامر حسینی کی تصنیف "وجودیت" فہیم کاظمی کی مرتبہ "سارتر کے مضامین" اور ان کے علاوہ وجودیت کے حوالے سے لکھے گئے مضامین اور مقالہ جات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

اس تحقیقی مقالے میں معاصر اردو غزل میں وجودیت کے انتہائی اہم اور رومانوی عناصر کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وجودیت کو قنوطی اور مایوس کن فلسفے کی بجائے ایک رومانٹک فلسفے کے روپ میں دریافت کیا گیا ہے۔ جس سے سماجی اور علمی سطح پر عصر حاضر سے میل کھاتے موضوع فرد کی آزادی کے متعلق وجودی فلاسفروں کا نقطہ نظر روشن اور واضح ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ معاصر اردو غزل کے منتخب شعراء ادبی اور شعری حوالے سے اہم اور اردو غزل کے چمکتے ستارے ہیں۔ ان کے حوالے سے کام اردو تحقیق میں بیش قیمت اضافے کے مترادف ہے۔ مزید یہ کہ اس حوالے سے اس طرح کا کوئی بھی قابل قدر تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ جبکہ منتخب شعراء معاصر اردو غزل میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور اس حوالے سے تحقیق یقینی طور پر سود مند ہے۔

جامعاتی سطح پر وجودیت کے حوالے سے بنیادی کام ہوا ہے لیکن اس تحقیقی کام کے باوجود کچھ پہلو اور زاویے ایسے تھے کہ جن پر وجودیت کے حوالے سے کام ہونا چاہیے تھا انھیں زاویوں میں سے اہم زاویہ فرد کی آزادی ہے۔ فرد کی آزادی کو وجودیت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس تحقیقی مقالے کی تکمیل سے وجودیت کی ذیل میں فرد کی آزادی جیسے اہم عنصر کے تفصیلی بیان کے ساتھ معاصر اردو غزل کے منتخب شعراء کی فرد کی آزادی کے حوالے سے کشمکش اور اس کی کلی اور جزوی صورتیں آشکار کی گئی ہیں۔

ب: وجودیت (تعارف و نظری مباحث)

انگریزی لفظ ''Existence'' کا اردو ترجمہ کیا جاتا ہے "وجود" جس کے معنی ہیں ہستی، زندگی، ظاہر ہونا یا موجود ہونا۔ اسی انگریزی لفظ ''Existence'' سے بنتا ہے ''Existentialism'' جس کا اردو ترجمہ ہے "وجودیت"۔ وجودیت ایک فلسفیانہ تحریک ہے جس میں فرد کی انفرادیت، استقامت اور اس کی آزادی پر زور دیا جاتا ہے۔ اگرچہ مرئی اشیا کے علاوہ غیر مرئی اشیا کے وجود کا تصور بھی موجود ہے جیسے جن، بھوت، فرشتے اور خدا وغیرہ کا وجود لیکن وجودیت کی فلسفیانہ تحریک میں لفظ "وجود" انسان کی ہستی اور اس کے ہونے سے مشروط ہے۔ وجودیت کی حتمی اور جامع تعریف کرنا کار محال ہے۔ مفکرین اس کی مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں۔ قاضی جاوید کا کہنا ہے:

> "وجودیت کی تعریف کرنا نہ صرف مشکل بلکہ خود وجودی نقطہ نظر ہی کے خلاف ہے کیوں کہ تعریف کا مطلب "جوہر" کا بیان ہے اور وجودیت انسان کے کسی جوہر کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں"(1)

وجودی فلسفے کے مختلف تصورات موجود ہیں جنھیں ایک لڑی میں پرونا مشکل ہے۔ تاہم مفکرین کی آرا کی روشنی میں ہم وجودیت کے ایسے خال و خد کو ابھارتے ہیں جن پر وجودی مفکرین اتفاق کرتے ہوں۔ وجودیت دراصل ایک خاص طرز فکر ہے جس میں تخیل رنگین ہے، جذبات کی شدت ہے اور جس میں فرد کی آزادی کی گونج ہے۔ وجودیت کا اصرار فرد کی انفرادیت ہے اور اس میں بنیادی حیثیت انسانی وجود کو حاصل ہے۔ وجودیت در حقیقت عقلی پہلوؤں کی بہ نسبت جذبی پہلوؤں کو اہمیت دیتی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر بختیار حسین صدیقی رقم طراز ہیں:

"وجودیت وہ طرزِ فکر ہے جو انسانی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کی ترکیب کے ذہنی اور عقلی پہلوؤں کی بجائے جذبی پہلو پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ عقل تجربہ اور کلیت کے چکر میں پھنس کر دور ہی سے حقیقت کو ہاتھ لگا کر نکل جاتی ہے۔ لیکن جذبہ وجود کے اندر گھس کر ہمیں دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتا ہے بعض جذبی کیفیات تو ایسی ہوتی ہیں جن کی حیثیت نفسیاتی کم اور وجودی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ان مسائل پر روشنی ڈالتی ہے، جن کا تعلق براہِ راست انسان کی اصل حقیقت اور اس کی منزلِ مقصود سے ہوتا ہے۔"(2)

قاضی جاوید کے مطابق:

"لفظ وجودیت کا مفہوم کیا ہے؟ یہ ہر قسم کے محض تجریدی، منطقی و سائنسی فلسفہ کی نفی ہے۔ یہ عقل کی مطلقیت سے انکار ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ فلسفہ کو فرد کی زندگی، تجربے اور اس تاریخی صورتِ حال سے گہرے طور پر مربوط ہونا چاہیے جس میں فرد خود کو پاتا ہے۔ فلسفہ ظن و تخمین کا کھیل نہیں بلکہ ایک طرزِ حیات ہے۔ یہ سب کچھ لفظِ وجود میں مضمر ہے۔ وجودی اعلان کرتا ہے کہ میں معروضی دنیا کی بجائے صرف اپنے حقیقی تجربے ہی کو جانتا ہوں۔ اس کے نزدیک ذاتی ہی حقیقی ہے۔"(3)

قاضی جاوید کی طرح سلطان علی شیدا بھی وجودیت کو منطقی اور سائنسی فلسفے کی نفی قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک وجودیت افلاطونی فلسفے کی ضد ہے اور وہ وجودیت کی جڑیں رومانیت میں دیکھتے ہیں۔ بقول سلطان علی شیدا:

"وجودیت کی جڑیں اس رومانیت میں پائی جاتی ہیں جو فرد کی اہمیت اور انفرادی آزادی کے نام پر اٹھارہویں صدی کی روشن خیالی اور عقلیت کے خلاف ایک بھرپور اور پر اثر احتجاج تھی۔ وجودیت اس افلاطونی فلسفے کی ضد ہے جو عالم موجودات سے آنکھیں پھیر کر اشیا کی ماہیت یا ان کے جوہر کو حقیقت سمجھتا ہے اور اسی کو تفکر

وادراک کا واحد مقصد ٹھہراتا ہے۔ افلاطون کے نظریہ تصوریت کے مطابق عالم موجودات ان ابدی اور لافانی تصورات کا ایک فانی اور ناقص پر تو ہے۔ اس کے بر عکس وجودیت کے لیے وجود انسانی ہی فلسفی کے لیے تمام تر دلچسپی اور توجہ کا مرکز ہے۔"(4)

وجودیت ایک فلسفیانہ تحریک ہے جس کے بیج مختلف مغربی ممالک میں پھوٹتے ہیں۔ یوں تو انیسویں صدی میں ڈنمارک کے فلسفی کرکیگارڈ کے افکار میں وجودیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن اس تحریک کا سہرا صرف کرکیگارڈ کے سر ہی نہیں جاتا بلکہ اس میں جرمنی اور فرانس کے فلسفیوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ بہر حال کرکیگارڈ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

قاضی جاوید اپنی کتاب "وجودیت" میں وجودیت کو عصر حاضر کی نمائندہ فکری تحریک قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس مکتب فکر کا بانی کرکیگارڈ ہے۔ وہ کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"وجودیت عصرِ حاضر کی نمائندہ تحریک ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ علم و حکمت ہو یا ادب و فن، الٰہیات ہو یا نفسیات، عمرانیات ہو یا اخلاقیات، وجودیت نے ان سب پر انمٹ نقوش مرتسم کیے ہیں۔ وجودی ادب میں تخیل کی رنگینی، فکر کی رفعت، جذبے کی شدت اور عواطف و امیال کی بوقلمونی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس مسلکِ فکر کا بانی سورین کرکیگارڈ ہے، جو ڈنمارک کا باشندہ تھا۔ فی زمانہ اسے جرمنی و فرانس میں عوامی مقبولیت حاصل ہے اور دیگر مغربی ممالک میں بھی اس کا چرچا ہو رہا ہے۔"(5)

سلطان علی شیدا تحریک کے اہم مفکرین کا تذکرہ کرتے ہوئے ژاں پال سارتر کو باقی سب پہ فوقیت دیتے ہیں اگرچہ سارتر بیسویں صدی کے آغاز میں آتے ہیں لیکن ان کا کام اور مقام باقیوں سے منفرد ہے۔ بلاشبہ ژاں پال سارتر کے شہرہ آفاق خطبے "وجودیت اور انسان دوستی" نے وجودیت کو زیادہ شہرت عطا کی اور اسے دوام بخشا۔ سلطان علی شیدا کے نزدیک سارتر مقبول تر ہے۔

"یہ تحریک انیسویں صدی میں ڈنمارک سے شروع ہوئی مگر اس کے خط و خال کو ابھارنے اور اس کو مقبول و مشہور بنانے میں جرمنی کے کارل یاسپرس (۱۸۸۳) و مارٹن ہائیڈ گر (۱۸۸۹) اور فرانس کے گیبرل مارسل (۱۸۸۹) اور ژاں پال سارتر (۱۹۰۵) کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر دو فلسفیوں نے ادبی تخلیقات کے ذریعے وجودیت کی جس طرح اشاعت کی ہے وہ تاریخ فلسفہ میں بے مثال ہے۔ ان دونوں میں سارتر مقبول

تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا مطالعہ کرنے والوں میں سے بیشتر کے لیے وجودیت سارتر کے فلسفۂ حیات یا اس کے دیگر فلسفیانہ خیالات کے ہم معنی ہے۔"(6)

وجودیت کی مزید وضاحت، اس پر لگے اعتراضات اور ژاں پال سارتر کے خطبے پر بحث سے قبل لازم ہے کہ اس تحریک کے سیاسی و سماجی پس منظر پہ ایک نظر ڈال لی جائے۔ کسی بھی تحریک کے پس منظر میں جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ مجموعی انسانی شعور نے ترقی کی منازل بڑے کڑے حالات کا مقابلہ کر کے طے کی ہیں۔

موجودہ مجموعی انسانی شعور جس سطح پر ہے وہ شروع سے اس مقام پر نہیں تھا۔ انسان نے زمانے کی شدید گردشوں کا سامنا کیا ہے۔ ظلم کی چکی میں پسا ہے۔ جبر برداشت کیا ہے قدرتی آفات کا سامنا کیا ہے۔ اپنے وجود سے لڑتا رہا۔ کشت وخوں کے دریا دیکھے ہیں۔ بھوک اور افلاس برداشت کیے ہیں ناداری اور محکومی دیکھی ہے۔ جنگ وجدل سے دوچار رہا ہے۔ صنعتی اور سائنسی انقلاب سے گزرا ہے۔ سرمائے کا تسلط دیکھا ہے۔ ظلم و ستم کے انبوہ اور زمانے کی ان گنت سختیوں سے گزر کر انسان نے سیکھا ہے، خود کا جانا ہے اور اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائی ہے، اپنی بقا کی جنگ لڑی ہے اور آزادی کی تحریکیں چلائی ہیں۔ وجودیت کی تحریک بھی ایک ایسا ہی خونی اور ظالمانہ پس منظر رکھتی ہے۔ چرچ کی اجارہ داری، انقلاب فرانس، صنعتی اور سائنسی انقلاب، سرمائے کا تسلط اور صدی کی دو بڑی جنگیں اس تحریک کا محرک بنی ہیں۔ بقول ڈاکٹر جمیل اختر محبی:

"فلسفہ وجودیت کا باضابطہ آغاز انقلاب فرانس کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن یہ برگ وبار دو عظیم جنگوں کے بعد ہی لاتا ہے۔ سائنس کی ترقی اور اخلاقی انحطاط وجودیت کے پودے کی آبیاری کرتے ہیں۔ چنانچہ وجودی فلسفے کو سمجھنے کے لیے انقلاب فرانس، دونوں جنگ عظیم، سائنسی اور تکنیکی ثقافت اور قدیم فلسفوں کا جائزہ ناگزیر شرط ٹھہرتا ہے۔"(7)

تاریخ میں زیادہ پیچھے جانے کی بجائے انقلاب فرانس سے سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ فرانس کا پرانا نظام انتہائی دقیانوسی اور بد نظمی کا شکار تھا۔ کھوکھلا معاشی نظام، کسان کا استحصال، مالی، انتظامی اور اقتصادی انتشار فرانس کو کھوکھلا کر چکا تھا گویا انقلاب کی آمد کے تمام لوازمات پورے تھے۔ ایسے حالات میں کچھ بڑے مصنفین اور مفکرین کے افکار کا عوام نے گہرا اثر لیا اور انقلاب برپا کر دیا۔ انقلاب فرانس کے نتیجہ میں نئی اقدار اور نئی انسانی آوازوں نے انگڑائی لی۔ ان نئی آوازوں اور اقدار میں

وجودیت کی جھلک کہیں کہیں موجود تھی۔اس وقت یورپ پر صنعتی انقلاب اور امریکی آزادی کی جنگ کے اثرات بھی گہرے ہیں۔امریکہ کی جنگ آزادی نے انگلستان کے اقتدار کی دیوار میں دراڑ ڈالی اور نو آبادیت کی بنیاد کو دھچکا پہنچایا۔درج بالا تینوں انقلاب دور رس نتائج رکھتے ہیں لیکن انقلاب فرانس نے جس راسخ العقیدگی سے لوگوں کو نجات دلوائی اس کے نتیجے میں جو شعور کی رمق بیدار ہوئی وہ اہمیت کی حامل ہے۔

وجودیت کی اصل ترویج اور توسیع جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم کے دور میں ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز کی دو بڑی جنگیں بڑی تباہی کا پیش خیمہ بنیں۔وقت کے سب خطرناک ہتھیار ایٹم بم تک چلا دیے گئے۔انسانیت کو اپاہج کیا گیا اور کھیتوں میں قحط بویا گیا۔مایوسی، ناامیدی، مفلسی، خوف وہراس اور دہشت کی فضا کو مسلط کر دیا گیا۔انسان میں بیگانگی پیدا ہونے لگی وہ خود کو دنیا میں غیر محفوظ تصور کرنے لگے۔اس تباہی میں انسان کے پاس اپنا وجود رہ گیا جس کو بنیاد بنا کر انسان نے مسائل حل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ زمین کی کوکھ سے جنم لینے والے ناسور نپولین اور ہٹلر جب انسانیت اور انسان کو حشرات الارض کی طرح بے رحمی سے کچلنا شروع کر دیں تو پھر انسانی بقا کے لیے "وجود جوہر پر مقدم ہے" کا نعرہ لگانا فرض ہو جاتا ہے۔

سائنس اگرچہ انسان کے فائدے کے لیے ہے لیکن اس نے بھی انسانی وجود اور انسانیت کو کچھ ایسے نقصان پہنچائے ہیں کہ انسان خود اس کا غلام بن جائے تو احساس وجذبات کو دھچکا لگتا ہے۔انسان اپنے بنائے ہوئے ہتھیاروں سے خوف زدہ ہے۔ سراسیمگی، لایعنیت، بوریت اور کرب بھی اسی سائنس کی دین ہے۔

وجودیت مذہبی اور اخلاقی پس منظر بھی رکھتی ہے۔ عقیدے اور مذہب کا زوال بھی اخلاقی انحطاط کی راہ ہموار کرتا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں مذہبی زوال نے نہ صرف خدا کو مشکوک بنایا ہے بلکہ "خدا مر گیا ہے" کا نعرہ بھی لگوا دیا ہے۔جب خدا ہی نہیں تو پھر اس کی طرف سے بنائے گئے اخلاقی ضابطے بھلا کیا وقعت رکھیں؟

خدا کے انکار کے بعد مذہبی اقدار اور مذہبی اخلاقی اقدار دم توڑنے لگیں اور انسان کچھ حد تک بے راہ روی کا شکار ہو گئے۔ روحانی انتشار نے جنم لیا اور اخلاقیات کا فقدان پیدا ہو گیا۔ایسے میں انسان خود کو سمیٹنے لگا اور اپنی داخلیت کو وقعت دینے لگا۔

وجودیت فلسفیانہ پس منظر بھی رکھتی ہے جس کی تفصیل میں جانے کی بجائے ہیگل کا تذکرہ کر دینا ہی کافی ہو گا۔ وجودیت کا فلسفہ Anti intellectualism بھی کہلاتا ہے جو کہ ہیگل کے نظریے سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ مکمل متضاد ہے۔ ہیگل عقلیت کو اہمیت دیتا ہے اور اس کا کہنا ہے "جوہر وجود پر مقدم ہے" جب کہ وجودیت کے مفکرین کا ماننا ہے "وجود جوہر پر مقدم ہے" کیوں کہ پہلے انسان کا وجود ہے اور پھر جوہر کا مقام ہے۔

وجودیت کے پس منظر پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سی۔ اے قادر نے کہا:

"وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔ یہ اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھتا ہے۔۔۔ یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔ انسان وحشیوں اور درندوں کی طرح لڑا۔ ہر قدر کو ٹھکرا دیا گیا۔ نہ اخلاق کا پاس رہا، نہ مذہب کا۔۔۔ جنگوں نے اخلاق اور مذہب دونوں کو تباہ کر دیا۔ نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق ان کے مسائل حل نہیں کر سکتا اور مذہب کی طفل تسلیاں ان کی بے چینی کو دور نہیں کر سکتیں۔ اگر پرانی اقدار ختم ہو چکیں، مذہب ناکارہ ہو چکا ہے اور فلسفہ دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وجودیت نے پیش کیا۔"(8)

وجودیت کے دو دبستان ہیں۔ الہیاتی وجودیت اور الحادی وجودیت۔

الہیاتی وجودیت والے خدا کی موجودگی کے قائل ہیں جب کہ الحادی وجودی خدا کی ذات کے منکر ہیں۔ الحادی وجودیت کے امام ژاں پال سارتر وجودیت کی اقسام کے حوالے سے لکھتا ہے:

"مسئلہ محض اس لیے پیچیدہ ہو گیا ہے کہ وجودیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک طرف مسیحی وجودی ہیں۔ ان میں جیسپرز اور جبرئیل مارسل کا نام لوں گا۔ یہ دونوں صاحبان پکے کیتھولک ہیں۔ دوسری طرف وجودی دہریے ہیں۔ ان کے گروہ میں ہیڈیگر کے علاوہ فرانسیسی وجودیوں اور خود مجھے شامل کرنا چاہیے۔ ان سب میں قدر مشترک صرف یہ ہے کہ ان کہ نزدیک وجود جوہر پر مقدم ہے۔"(9)

الہیاتی مفکرین جوہر کو وجود پر مقدم جانتے ہوئے پلنگ، کاغذ تراش یا کسی کتاب وغیرہ کی مثال دیتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بننے سے پہلے بنانے والے کے دماغ میں تھیں۔ یہ اشیا ایک مخصوص انداز میں ایک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی

گئی ہیں۔ اسی طرح کائنات اور انسان بھی بننے سے پہلے بنانے والے یعنی خدا کے ذہن میں تھے اسی لیے جوہر کو وجود پر اولیت اور فوقیت دی جاتی ہے۔ جب کہ الحادی وجودیت کے علم بردار ژاں پال سارتر کا کہنا ہے:

"جس دہری وجودیت کا میں ایک نمائندہ ہوں، وہ زیادہ استقامت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اگر خدا موجود نہیں تو بھی کم از کم ایک ہستی ایسی ضرور ہے جس کا وجود اسکے جوہر پر مقدم ہے۔ یعنی ایک ہستی جو اپنے تصور سے پہلے موجود ہوتی ہے۔ یہ ہستی انسان ہے۔ ہیڈیگر کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ انسانی حقیقت ہے۔(10)

سارتر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

"وجود کو جوہر پر مقدم قرار دینے سے ہمارا مطلب کیا ہے؟ ہمارا مطلب یہ ہے کہ انسان پہلے وجود رکھتا ہے۔ اپنے آپ کا سامنا کرتا ہے، دنیا میں ابھرتا ہے، اس کے بعد ہی اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک انسان کی تعریف اس لیے محال ہے کہ ابتدا میں وہ وہی کچھ کرتا ہے جو خود کو بناتا ہے۔ انسانی فطرت نام کی کسی شے کا وجود نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خود خدا ہی موجود نہیں جو پہلے سے اس کا تصور کر سکے۔ انسان تو بس ہے۔ وہ محض وہی کچھ نہیں جو خود کو سمجھتا ہے بلکہ وہ کچھ بھی ہے جو ارادہ کرتا ہے۔ وجود میں آنے کے بعد یہ وہ اپنے متعلق تصور قائم کرتا ہے اور وجود میں چھلانگنے کے بعد ہی ارادہ کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان صرف وہی کچھ ہے جو کچھ اپنے آپ کو بناتا ہے،"(11)

سارتر اگرچہ الحادی مفکر ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ اگر خدا موجود بھی ہو تو اس کے نقطہ نظر کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا ۔اس نکتے کی وضاحت سارتر کچھ اس طرح کرتا ہے:

"وجودیت اس لحاظ سے دہریت نہیں کہ وہ خود کو خدا کے نہ ہونے کی وضاحت کے لیے وقف کر دے۔ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ خدا موجود ہو تو بھی اس کے نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ نہیں کہ ہمارے نزدیک خدا وجود نہیں رکھتا ہے، بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اصل مسئلہ اس کے وجود کا نہیں اصل میں انسان کو ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ از سر نو اپنے آپ کو دریافت کرے اور یہ جان لے کہ اپنی ذات سے اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ خدا کے وجود کا ٹھوس ثبوت بھی اسے نجات نہیں دلا سکتا۔"(12)

ژاں پال سارتر کا خطبہ بنیادی طور پر ان اعتراضات کا جواب ہے جو عام طور پر وجودیت پر کیے جاتے ہیں۔ سارتر نے خطبے کے آغاز میں وجودیت کا دفاع کرنے کی غرض سے ان اعتراضات کا ذکر کیا اور پھر ایک ایک کر کے ان اعتراضات کے جواب پیش کیے۔ عام طور پر وجودیت کو داخلیت سمجھا جاتا ہے، وجودیوں پر الزام ہے کہ انھوں نے انسان کو تنہا کیا اور وجودیت نے یاس، نا امیدی اور بیگانگی پھیلانے کی کوشش کی۔ خطبے کے آغاز میں سارتر نے وجودیت پر کیے جانے والے اعتراضات کو سرسری انداز میں کچھ یوں بیان کیا:

"دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ ہم نے ہر اس شے کو اہمیت دی ہے جو انسانی صورت حال میں شرمناک ہے۔ ہر اس شے کو نمایاں کیا ہے جو حقیر اور بے مایہ ہے ان چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو حسن و دلکشی کی حامل ہیں اور انسانی فطرت کے روشن پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ ایک کیتھولک نقاد مرسے کے بقول ہم نے یہ بھلا دیا ہے کہ بچہ کیسے مسکراتا ہے۔ دوسری طرف یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ ہم نسل انسانی کی وحدت کو نظر انداز کر کے فرد کو توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ کمیونسٹوں کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے نظریے کی بنیاد خالص داخلیت پر رکھتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہم فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کی طرح اپنے نظریے کی اساس 'میں سوچتا ہوں' پر رکھتے ہیں۔"(13)

سارتر نے وجودیت پر کیے گئے دو بڑے اعتراضات پر زیادہ زور دیا ہے ان میں سے ایک ہے "وجودیت داخلیت ہے" اور دوسرا یہ کہ وجودیت قنوطی فلسفہ ہے جو مایوسی اور نا امیدی پھیلاتا ہے یا قناعت پسندی پر مجبور کرتا ہے۔ پہلے اعتراض کے جواب میں سارتر نے کہا:

"لوگ ہم پر طنز کرنے کی خاطر وجودیت 'داخلیت' کہتے ہیں حالاں کہ اس اصول پر زور دینے سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ انسان کا رتبہ اینٹ یا پتھر سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ انسان سب سے پہلے تو وجود رکھتا ہے۔ اس کے وجود کو اولیت حاصل ہے۔ وجود ہی اسے مستقبل کی جانب دھکیلتا ہے اور وہ اپنے اس عمل سے آگاہ بھی ہوتا ہے۔ انسان پھپھوندی یا گھاس پھونس نہیں بلکہ حقیقت میں ایک منصوبہ ہے اور داخلی زندگی کا حامل ہے۔ ذات کے اس منصوبے کے اظہار سے پہلے کچھ موجود نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اقلیم میں بھی کچھ نہیں ہوتا۔ انسان صرف اسی وقت وجود حاصل کرتا ہے جب وہ وہی کچھ بنتا ہے جو خود کو بنانا چاہتا ہے۔ تاہم محض کچھ ہونے کی خواہش کافی نہیں۔"(14)

سارتر لفظ "داخلیت" کے دو معنی بیان کرتا ہے اور ان کی وضاحت کچھ یوں کرتا ہے:

"داخلیت کے لفظ کو دو معنوں میں سمجھا جا سکتا ہے لیکن ہمارے مخالفین ان میں سے صرف ایک پر نگاہ رکھتے۔ ایک طرف داخلیت کا مطلب انسان کی آزادی ہے اور دوسری طرف اس سے مراد یہ ہے کہ انسان انسانی داخلیت کی حدود کو پار نہیں کر سکتا۔ موخر الذکر مفہوم وجودیت کا گہرا مفہوم ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان خود کو منتخب کرتا ہے تو ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں ہم میں سے ہر ایک کو اپنے متعلق لازماً خود فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری مراد یہ بھی ہوتی ہے کہ اپنے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے انسان ساری نسل انسانی کے متعلق بھی فیصلہ کرتا ہے۔"(15)

وجودیت کو قنوطیت یا قناعت پسندی کا فلسفہ سمجھنے والوں کو سارتر بڑی شدت سے جواب دیتا ہے اور ان کے اس اعتراض کو پوری طرح رد کر دیتا ہے۔ نہ صرف رد کرتا ہے بلکہ یہ ثابت کرنے کی سعی کرتا ہے کہ وجودیت قناعت پسندی یا قنوطیت نہیں بلکہ یہ تو ایک مکمل رجائی فلسفہ ہے۔ سارتر وجودیت کو مایوسی، یاس انگیزی، ناامیدی، تنہائی اور قناعت پسندی ہرگز نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک وجودیت رجائیت ہے۔ بقول ژاں پال سارتر:

"وجودیت کو قناعت پسندی کا فلسفہ قرار نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ وجودیت انسان کا تعین ہی اس کے عمل سے کرتی ہے اور انسان کی کوئی یاس انگیز تصویر پیش نہیں کرتی۔ اس سے زیادہ رجائی اور کوئی فلسفہ نہیں جس نے انسان کا مقدر اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ یہ فلسفہ انسان کو عمل سے نہیں روکتا۔ اس کا کہنا تو یہ ہے کہ عمل کے سوا کوئی امید نہیں اور یہ کہ عمل ہی انسان کو زندگی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا اس سطح پر ہم جس شے پر غور کر رہے ہیں وہ عمل اور کومٹ منٹ کا اخلاق ہے۔"(16)

سارتر وجودیت کو امید پرست نظریہ قرار دیتے ہوئے اپنی بحث کو کچھ اس طرح سمیٹتا ہے:

"وجودیت امید پرست نظریہ ہے۔ یہ عمل کا فلسفہ ہے اور مذہبی لوگ اپنی خود فریبی اور مایوسی کو ہم سے منسوب کر کے ہی ہمیں امید سے محرومی قرار دیتے ہیں۔"(17)

درج بالا حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے وجودیت سے متعلق ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وجودیت ایک مغربی فلسفیانہ تحریک ہے جو انیسویں صدی میں شروع ہوئی۔ یہ فلسفہ انسانی وجود سے متعلق بحث کرتا رہا ہے۔ وجودیت گزشتہ کئی صدیوں کے

جبر کے بعد انسانی وجود کی بقا کے لیے اٹھنے والی تحریک ہے جو طبقاتی استحصال اور انسانی انفرادیت کھونے کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ اس کے دو بڑے گروہ الہیاتی اور الحادی ہیں۔ الہیاتی خدا کے قائل ہیں جب کہ الحادی خدا کے منکر ہیں۔ الہیاتی جوہر کو وجود پر مقدم قرار دیتے ہیں جب کہ الحادی وجود کو جوہر پر مقدم مانتے ہیں۔ الحادیوں کے نزدیک وجودیت ایک امید پرست اور مکمل رجائی نظریہ ہے جو انسان کے مقدر کو اس کے ہاتھ میں دیتا ہے۔

i۔ فرد کی آزادی

وجودیت انفرادی انسانی وجود، آزادی اور انتخاب پر زور دیتی ہوئی ایک فلسفیانہ اور ادبی تحریک ہے جو فرد کو سوچ کی آزادی، انتخاب کی آزادی اور عمل کی آزادی دیتی ہے۔ یہ تحریک فرد کو خود مختاری عطا کرتی ہے، فرد کو قانون ساز اور ماورائیت کا مرکز قرار دیتی ہے۔ فرد کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنی ذمہ داری خود اٹھانی ہے اگر خدا ہے تو بھی اگر نہیں ہے تو تب بھی ہمیں اپنا وجود قبول کرنا ہے۔ خود کو دریافت کرنا ہے اور خود کو خود بنانا ہے۔ اپنی داخلی کائنات اور باطن کی اہمیت کو سمجھنا ہے۔ فرد نے اپنے مسائل خود حل کرنے ہیں۔ غیر یقینی صورتِ حال، بیگانگی مایوسی اور خوف کا سامنا کرنا ہے اور اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہونا ہے۔ فرد کی انفرادی زندگی اور اس کو آزادانہ طور پر بسر کرنا ہے ہی وجودیت کا موضوع ہے۔ ژاں پال سارتر فرد کی آزادی کے حوالے سے لکھتا ہے:

> "انسان ایک ایسی ہستی ہے جس کا وجود جوہر پر مقدم ہے اور یہ کہ وہ آزاد ہے اور ہر حالت میں آزادی کے سوا اور کچھ نہیں چاہ سکتا تو ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں دوسروں کی آزادی کو چاہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس طرح آزادی کے اس عزم کے نام پر جو آزادی میں مضر ہے، میں لوگوں کے بارے میں فیصلہ کر سکتا ہوں جو اپنے وجود کی ارادی فطرت اور اس کی کامل آزادی کو اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ میں ان لوگوں کو بزدل کہوں گا جو وقار اور جبری عذر کی اوٹ میں اس مکمل آزادی سے چھپتے ہیں۔" (18)

یہاں یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ آزادی بے لگام ہو جانے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی بے راہ روی ہے اور نہ ہی حیوانی جبلتوں کا اپنے اوپر غلبہ ہے۔ اگر فرد کی آزادی کو بے لگامی مان لیا جائے تو پھر ہر وہ شخص جو طاقت ور ہے۔ وہ کمزور کی آزادی کو سلب کر لے، حیوانی جبلتوں کا غلبہ ہو اور قانون کی دھجیاں اڑ جائیں۔ وجودی مفکرین کے نزدیک منفی کی بجائے اگر مثبت آزادی ہو گی تو وہی معاشرے میں خیر کا باعث ہو گی اور مثبت آزادی میں چند بندشیں بھی ہوں گی۔ سارتر

آزادی سے متعلق مدلل گفتگو کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ ایک فرد کی آزادی کا انحصار دوسروں کی آزادی پر بھی ہے۔اہم بات یہ کہ آزادی میں انسان دوستی کے پہلو کو خاص اہمیت دینا ہو گی تبھی آزادی کا تصور بہتر طور پر پروان چڑھے گا۔ سارتر نے اپنے خطبے میں انسان دوستی کو بہت اہمیت دی ہے۔بقول سارتر:

"یہ انسان دوستی اس حوالے سے ہے کہ ہم انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ بس وہ خود ہی قانون ساز ہے اور یہ کہ اس نے اپنے لیے خود ہی فیصلہ کرنا ہے۔ یہ انسان دوستی اس اعتبار سے بھی ہے کہ ہم ثابت کرتے ہیں کہ انسان خود کو واقعی انسان اسی وقت بنا سکتا ہے جب وہ خود سے منہ موڑنے کی بجائے ہمیشہ اپنے باہر ایسا مقصد تلاش کرے جو یا تو آزادی ہو یا کوئی اور مخصوص شعور۔"(19)

قاضی جاوید، مارٹن ہائیڈیگر کے وجودیت سے متعلق نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے فرد کی آزادی سے متعلق کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"ذاتِ مصدقہ آزادانہ طور پر دنیا کی تشریح و توجیہ کرتی ہے۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔اس لیے ماورا کی کوئی معروضی سائنس ممکن نہیں۔ یہاں کانٹ کے معقولات بھی بے کار ہیں۔ فقط آزادی کا مقولہ ہی ہماری رہنمائی کر سکتا ہے، جس کی سائنسی تصدیق یا تکذیب ممکن نہیں۔آزادی انتخاب سے مربوط ہے۔"(20)

وجودیت میں فرد کی آزادی سے متعلق کولن ولسن کے رائے اہمیت کی حامل ہے اس کا کہنا ہے:

"ایک فلسفی کی حیثیت سے وجودیت کا فرض ہے کہ وہ انسانی ارادے کی افضیلت، فرد کی اہمیت اور حد درجہ نیوروسٹک اور کنڈیشنڈ انسان کی بھی آزادی پر زور دے اور اس بات پر اصرار کرے کہ آدمی کے طرزِ عمل کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔"(21)

کولن ولسن وجودیت کو رومانیت کی ترقی یافتہ شکل سمجھتا ہے اور وہ کرکیگارڈ اور سارتر کی روایتی وجودیت آگے قدم بڑھائے ہوئے اپنے فلسفے کو "نئی وجودیت" کا نام دیتا ہے۔اس طرح وہ سمجھتا ہے کہ مرتی ہوئی وجودیت میں از سرِ نو روح پھونکی جا رہی ہے۔ وہ سارتر کی فرد کی آزادی سے متعلق فکر پر سوال اٹھاتا ہے۔ اگرچہ وہ آزادی کا قائل ہے لیکن وہ اس آزادی سے بے زار دکھائی دیتا ہے اور دنیا کو لغو و لایعنی خیال کرتا ہے۔اس کا کہنا ہے:

"سارتر انسان کی مطلق آزادی کی منادی کرتا ہے۔ لیکن ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ بجا فرماتے ہیں لیکن یہ تو بتایئے کہ ہمیں اپنی آزادی سے کیا کام لینا ہے؟ سارتر کا جواب یہ ہے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ تاہم جیسے ہر کسی کا فرض عملی طور پر کسی کا بھی فرض نہیں ہوتا، ویسے ہی ہر شے کی آزادی فی الحقیقت کسی شے کی بھی آزادی نہیں۔ فرد آزاد ہے، لیکن دنیا لغو و لایعنی ہے۔"(22)

اس تمام بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فرد کی آزادی فی زمانہ لازم ہے۔ فرد کو سوچ، انتخاب اور عمل کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ اس کی انفرادیت متاثر نہ ہو۔ وہ اپنی داخلیت کو اور اپنے وجود کو اہمیت دے۔ اپنے مسائل آپ حل کرنے کی ذمہ داری اٹھائے اور خود مختار بنے۔

ii۔ فرد کی آزادی کے عناصر

سوچ، انتخاب اور عمل فرد کی آزادی کے اہم عناصر ہیں۔ انسان بنا بنایا نہیں ہے بلکہ اسے خود کو خود بنانا ہے۔ اسے اپنے وجود اور داخلیت پر توجہ دے کر اپنی سوچ اور اپنے انتخاب سے آزادانہ فیصلے کر کے اپنی آزادی کو یقینی بنانا ہے۔ جب فرد کی آزادی کی بات کی جاتی ہے تو پھر ان عناصر کا تجزیہ کیا جاتا ہے جو فرد کی آزادی کو یقینی بناتے ہیں اور وہ عناصر انسان کی سوچ اور انتخاب ہیں۔ دراصل انسان بیگانگی کا شکار ہو چکا ہے۔ صنعتی انقلاب نے اسے فطرت سے دور کر کے شہروں میں جمع کیا جہاں مشینوں نے اس کے سکون کو غارت کیا۔ سرمایہ داریت نے اس کا خون چوسا۔ معاشی اور سماجی کش مکش اسے سماج سے بے گانہ کرتی چلی گئی اور عقلیت پسندی انسان کو اس کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور محسوسات سے بے گانہ کرتی چلی گئی۔ خارجی دنیا کے جھمیلوں نے انسان کے اندرون کو بہت چھلنی کیا۔ جس سے ذہنی عدم توازن جنم لینے لگا، پریشانی، خوف وہراس اور تنہائی کا احساس پیدا ہونے لگا۔ وجودی مفکرین کا کہنا ہے کہ جب ایسے حالات میں انسان نفسیاتی مریض ہوتا جا رہا ہے اور مشین بنتا جا رہا ہے تو لازم ہے کہ اس کی داخلیت کو خارجیت پر فوقیت دی جائے اور اسے سوچ کی اور انتخاب کی آزادی دی جائے۔

جب انسان سوچنے میں انتخاب کرنے میں آزاد ہو جائے گا تو ہم کہہ سکیں گے کہ فرد آزاد ہے لیکن آزادی کا مطلب بے لگامی نہیں بلکہ ذمہ داری ہو گا۔ سارتر کی آزادی کا نظریہ فرد کو ذمہ داری کا درس دیتا ہے اس کا ماننا ہے کہ خدا نہیں ہے اس لیے اپنی نااہلی اور نالائقی کا بوجھ خدا کے کندھے پہ نہیں ڈال سکتے بلکہ آپ کو اپنے افعال کی خود ذمہ داری لینا ہو گی نہ

صرف اپنی حد تک بلکہ اپنے اعمال و افعال میں باقی تمام انسانوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا۔اس ضمن میں سلطان علی شید الکھتے ہیں:

"سارتر کا نظریہ آزادی انسان کو صرف اپنے اعمال و حرکات کا ذمہ دار نہیں بناتا بلکہ اس کے تمام تر احساسات وجذبات کی کلیتاً ذمہ داری بھی اس پر عائد کرتا ہے علاوہ بریں فرد اپنے ارادی اعمال و انتخاب میں صرف اپنی ذات کے لیے ہی فیصلے نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسان کی طرف سے یہ فیصلے کرتا ہے۔"(23)

وجودیت کے ذیل میں فرد کی آزادی کی جب بات ہوتی ہے تو سب سے پہلے سوچ کی آزادی زیرِ بحث آتی ہے۔انتخاب اور عمل تو آگے کے مراحل ہیں پہلے نوعِ انسان کو سوچنے کی آزادی تو ملے۔وجودیوں کا ماننا ہے کہ ہر فرد سوچنے میں آزاد ہو اور آزادی سے اپنے تمام فیصلے کرے۔اس ضمن میں ژاں پال سارتر لکھتا ہے:

"مجھے اس بات کا بھی یقین نہیں کہ میرے ساتھی میری موت کے بعد میرا کام سنبھال لیں گے اور اس کی تکمیل کریں گے۔اس کا سبب یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ آزاد ہیں اور آزادی ہی سے آئندہ اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ انسان کو کیسا ہونا چاہیے۔کل میری موت کے بعد بعض لوگ فاشزم کو رائج کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگ اس قدر بزدل یا کاہل ہوں کہ وہ ان کی مزاحمت نہ کریں۔ ایسا ہوا تو فاشزم ہی انسان کی سچائی قرار پائے گا۔ظاہر ہے کہ میرے لیے یہ بات بدتر ہوگی۔قصہ مختصر یہ کہ چیزیں ویسی ہی ہوں گی جیسی کہ انسان انہیں بنانا چاہیں گے تو کیا اس مطلب یہ ہے کہ میں راضی برضا ہو جاؤں؟نہیں۔"(24)

سارتر کا کہنا ہے کہ انسان اپنی تخیلی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی سوچ اور انتخاب سے خود کو خود بناتا ہے اور اسے وہی کچھ سمجھنا چاہیے جو وہ خود کو بنا پاتا ہے۔اس ضمن میں وہ اپنی کتاب "وجودیت اور انسان دوستی" میں کچھ یوں رقم طراز ہے:

"محبت کرنے کی صلاحیت بھی بس وہ ہے جس کا اظہار محبت کرنے میں ہو۔ذہانت وہ ہے جس کا اظہار فن کے کسی شاہکار میں ہو۔پروست کی ذہانت اس کی تصانیف کے مجموعے کے علاوہ کچھ نہیں۔راسین کی تخلیقی صلاحیتیں وہی ہیں جو اس کے المیوں میں ظاہر ہوئیں۔آخر ہم راسین سے ایک اور المیہ لکھنے کی اہلیت منسوب

کیوں کریں جب کہ اس نے ایسا کیا ہی نہیں؟ زندگی میں انسان خود اپنا فیصلہ کرتا ہے، اپنی شبیہ کی تشکیل کرتا ہے اور اس شبیہ کے سوا وہ اور کچھ بھی نہیں ہوا کرتا۔"(25)

آزادیِ انتخاب

فرد کی آزادی کے عناصر میں اہم ترین جزو آزادیِ انتخاب ہے جس پہ وجودی مفکرین بھرپور زور دیتے ہیں۔ آزادیِ انتخاب آزادی کے بنیادی محرکات اور عناصر میں سے ایک ہے یہ وہ پہلو ہے جس کی ضرورت پہلے مرحلے میں پیش آتی ہے اگر انسان انتخاب نہیں کرے گا تو عمل تک کیسے پہنچے گا۔ انتخاب عمل سے پہلے ایک درجہ ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر انتخاب کا ایک عمل ہو۔ انتخاب نہ کرنا بھی ایک انتخاب ہے جس کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ عام فہم زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتخاب سے مراد چننا ہے کہ انسان اپنے لیے کیا چنتا ہے اور اپنی زندگی کے بارے میں کیا فیصلے لیتا ہے۔ انتخاب کے بارے میں سارتر کا کہنا ہے:

"صرف انتخاب ممکن ہے انتخاب نہ کرنا محال ہے۔ میں ہمیشہ انتخاب کر سکتا ہوں۔ تاہم مجھے یاد رکھنا چاہیے کہ اگر میں انتخاب نہ کروں تو یہ بھی بہ جائے خود ایک انتخاب ہی ہوگا۔"(26)

ضروری نہیں کہ وجود پہلے سے طے شدہ روایات اور اقدار کی پاسداری کرے یا پہلے سے موجود اچھائی کو منتخب کرے۔ وجود تازہ انتخاب میں آزاد ہے اور اسے آزاد رہنا ہوگا۔ وجودی مفکرین حضرت ابراہیم کی مثال دیتے ہیں کہ انھوں نے پہلے سے موجود روایات و اقدار اور سچائیوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اپنے نومولود بچے اور بیوی کو بیابان میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اگر بیٹے کو ذبح کرنے والی مِتھ کو دیکھا جائے تو وہاں بھی زمانے کے چلن سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی اخلاقی ضابطے کا پابند ہوئے بغیر انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ مارٹن ہائیڈ گر کے بقول:

"اخلاق کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں۔ ہم جس لمحے میں موجود ہیں اسی گریز پا لمحے میں ہماری گریزاں اخلاقی قدروں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اس لمحے میں ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں ہم مختارِ مطلق ہیں۔ اس وقت جو کچھ بھی ہم کریں وہی ہمارا اخلاق ہے۔"(27)

نوجوان کو ماں یا وطن کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ماں بوڑھی اور بیمار ہے اور وہ اس کا واحد سہارا ہے۔ دوسری طرف وطن کی پکار ہے دشمنوں کی للکار ہے۔ وطن سلامت ہوگا تو گھر بار اور رشتے باقی رہیں گے۔ اس کش

مکش کے عالم میں اس نوجوان کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے۔ یہاں سارتر بڑی دلچسپ فضا تخلیق کرتا ہے اور فلسفیانہ بحث کرتا ہے کہ وہ نوجوان کس سے مشورہ لے؟ وہ جس بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے شخص سے مشورہ لے گا اسے پتہ ہو گا کہ وہ اسے کیا کہنے والا ہے۔ یہ ایک مشکل ترین فیصلہ ہے۔ سارتر کہتا ہے کہ اس فیصلے کو اس نوجوان پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ہاں اس کی اتنی راہنمائی کی جاسکتی ہے کہ جب انتخاب کرنا مشکل ہو جائے تو پھر احساس کے ذریعے انتخاب کا فیصلہ کیا جائے۔ سارتر کے نزدیک احساس بہتر انتخاب کروا سکتا ہے۔ بقول ژاں پال سارتر:

"آخر احساس ہی اہمیت رکھتا ہے۔ جس سمت میں احساس مجھے دھکیل رہا ہے، مجھے اسی کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اگر میں محسوس کروں کہ ماں سے مجھے اس قدر محبت ہے کہ اس کی خاطر سب کچھ قربان کر دوں، یعنی انتقام لینے کا ارادہ، عمل اور مہم جوئی کو خواہش، تب مجھے ماں کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر میرا احساس یہ ہو کہ ماں کی چاہت کافی نہیں تو پھر مجھے محاذ پر چلے جانا چاہیے۔"(28)

فرد کی آزادی اور آزادی کے عناصر میں سوچ اور انتخاب کے ساتھ ساتھ ابلاغ کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ بات نہ کہنا اور بات نہ سننا بھی آزادی پہ قدغن ہے۔ گویا ہونا ہے تو لب آزاد کرنے ہوں گے۔ آزادیِ اظہار پہ پابندی انسانیت پہ جبر ہے۔ انسانوں کے درمیان اظہار اور ابلاغ کی بنیادی اہمیت ہے۔ سلطان علی شیدا کے نزدیک صرف یاسپرس ہی وہ وجودی فلسفی ہے جو ابلاغ کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔

"وجودیت پسند فلسفیوں میں صرف یاسپرس نے ابلاغ کی اہمیت کو سمجھا ہے اور اس کو اپنے طور سے سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ ابلاغ کو آزاد افراد کے درمیان مناسب رشتوں کی بنیاد سمجھتا ہے۔ تاریخی حالات میں پابجولاں فرد اس بات پر ہمیشہ مائل رہتا ہے کہ وہ جو کچھ سوچتا، محسوس کرتا اور تصور کرتا ہے اس کو دوسروں تک پہنچائے کیوں کہ وجود اور دوسروں کی ذات کے ساتھ ہمدردی اور سمجھداری کا برتاؤ اس سماجی عمل کے بغیر ممکن نہیں۔"(29)

آزادیِ عمل

فرد کی آزادی کے عناصر میں سوچ، انتخاب اور ابلاغ کے بعد اگلا مرحلہ عمل کا ہے۔ آزادیِ عمل سے مراد ہے کہ کسی مذہبی نظریے، کسی سیاسی، سماجی یا صنعتی دباؤ کے بغیر انسان کو وہ کچھ کرنے کی اجازت ہو جو اس نے سوچا ہے یا جس کا انتخاب کیا ہے۔ کسی مذہبی تناظر میں کوئی توکل پسندی عمل کی آزادی کی راہ میں حائل نہ ہو۔ بقول سارتر:

> "توکل پسندی کے حامی وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جو میں نہیں کر سکتا وہ دوسرے کریں۔ جو نظریہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وہ اس کے بالکل برعکس ہے، کیوں کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ عمل کے سوا کوئی حقیقت نہیں۔ حقیقتاً یہ نظریہ اس سے بھی آگے جاتا ہے اور اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ انسان وہی کچھ ہے جو اس کا مقصد ہے۔ وہ اسی حد تک وجود رکھتا ہے جس حد تک وہ اپنی تکمیل کرتا ہے۔ للٰذا وہ اپنے اعمال کے علاوہ کچھ نہیں۔ بس وہی کچھ ہے جو اس کی زندگی ہے۔"(30)

سارتر کے نزدیک عمل ہی حقیقت ہے اور اسی کے ذریعے وجود کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ عمل کوئی وقتی طریقہ کار نہیں ہے بلکہ یہ انسانی وجود میں موجود ایک لہر کی مانند ہے جس نے رواں دواں رہنا ہے۔ کیوں کہ اسی عمل نے انسانی وجود کو پختگی عطا کرنی ہے۔ جس احساسِ ذمہ داری کا سارتر بار بار ذکر کرتا ہے وہ دراصل عمل ہی سے پیوستہ ہے۔ سارتر چونکہ الحادی دبستان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کا ماننا ہے کہ انسان نے اپنے اعمال کا بوجھ خود اٹھانا ہے للٰذا اسے پوری ذمہ داری سے یہ فرض ادا کرنا ہو گا کیوں کہ کوئی خدا اس کے اعمال کا بوجھ نہیں اٹھانے والا۔ سارتر کے مطابق انسان کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے:

> "ہم (وجودیت) کو توکل پسندی کا فلسفہ قرار نہیں دے سکتے کیوں کہ یہ آدمی کی تعریف اس کے اعمال سے کرتی ہے۔ اس نے آدمی کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں دے دی ہے۔ نہ ہی یہ انسان کو عمل سے روکتی ہے۔ وجودیت بتاتی ہے کہ اگر امید کوئی چیز ہے تو وہ اس کے عمل میں ہے۔ وہ جو اسے زندگی بخشتی ہے، عمل ہے"(31)

الحادی دبستاں میں سارتر یا الہیاتی دبستان میں کرکیگارڈ ہو سبھی وجودی فلاسفہ کے ہاں آزادی کا تصور موجود ہے۔

وجودی مفکرین کی آرا کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فرد کی آزادی کے اہم عناصر میں سوچ، انتخاب، عمل اور ابلاغ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر بھی قد غن انسانی وجود پر ظلم کے زمرے میں آتی ہے۔ انسان اس دنیا میں آگیا ہے تو پھر اپنے اعمال، اقوال اور افعال میں آزاد ہے۔ اسے یہ آزادی دینی ہوگی۔

iii۔ وجودی مفکرین کی آرا اور فرد کی آزادی کی اہمیت

انسانی مجموعی شعور جہاں پہنچ چکا ہے وہاں آزادی کی اہمیت بیان کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم جہان اور موجودہ علوم انسانی آزادی ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ انسان کی فکری آزادی ہے جو نئے جہانوں ہی کی تلاش میں مگن ہے۔ انسان نے اپنی آزادی ہی سے اپنی دنیا بہ یک وقت مشکل اور آسان بنائی ہے۔ وجودیت کا احسان ہے کہ انسان روایات و اقدار، نظریات اور اعتقادات کی فصیلوں کو پھلانگ کر اپنی آزادی کا حق استعمال کرتے ہوئے عہد آفریں دور میں داخل ہوا۔ وجودی مفکرین نے جہاں فرد کی آزادی کے لیے آواز اٹھائی ہے وہیں فرد پر بھاری ذمہ داری بھی عائد کر دی ہے۔ کچھ مفکرین نے عدمیت اور لاشئیت کے زیرِ اثر دنیا کو لغو اور لایعنی قرار دے کر سوال اٹھایا ہے کہ آپ آزادی کا کریں گے کیا؟ ذیل میں وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کی اہمیت کو وجود مفکرین کی آرا کی روشنی میں دیکھتے ہیں تاکہ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو ہو سکے۔

سارتر وہ وجودی مفکر ہے جس کا تعلق الحادی وجودیت سے ہے اور جو سب سے زیادہ فرد کی آزادی اور آزادی کی اہمیت پر زور دیتا ہے لیکن وہ اس آزادی کے ساتھ بندشیں بھی عائد کر دیتا ہے۔

پہلی بندش تو یہ ہے کہ انسان نے ذمہ داری اٹھائی ہے کیوں کہ اسے آزاد رہنے کی سزا ملی ہے۔ اس ضمن میں سارتر کہتا ہے:

> "جب میں یہ کہتا ہوں کہ انسان کو آزاد رہنے کی سزا ملی ہے یا یہ کہ آزادی انسان کی سزا ہے۔ سزا اس لیے کہ اس نے خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا۔ اس کے باوجود وہ آزاد ہے اور جس لمحے سے اسے دنیا میں پھینکا گیا ہے وہ اپنے عمل کا خود ہی ذمہ دار ہے۔"(32)

سارتر کی آزادی کے نظریے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک فرد کی آزادی دوسروں کی آزادی پر انحصار کرتی ہے۔اس لیے اپنے آزادانہ فیصلوں میں بنی نوع انسان کا خیال رکھنالازم ہے۔

پروفیسر بختیار صدیقی، سارتر کے نظریات کے حامی ہیں اور ان کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔پروفیسر صاحب کے نزدیک آزادی کی یہ اہمیت ہے کہ انسان آزاد رہ کے جو فیصلے کرتا ہے ان سے نئی قدریں جنم لیتی ہیں گو یا نئی قدروں کے لیے لازم ہے کہ فرد فیصلوں میں آزاد ہو۔بقول پروفیسر بختیار صدیقی:

"وجود علم نہیں شخصی عمل و فیصلہ ہے۔یہ فیصلہ انسان جذبے کی پوری طاقت اور آزادی سے کرتا ہے۔اس لیے وہ تنِ تنہا اس کا ذمہ دار ہے۔کوئی اخلاقی اصول، کوئی سماجی قانون، کوئی عقلی تصور اور کوئی معروضی نظریہ اس کے فیصلے کا محرک نہیں۔ہر خارجی معیار سے قطع نظر وہ خالص داخلیت کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل کا فیصلہ کرتا ہے اور ہر فیصلے کے ذریعے ایک نئی قدر کو جنم دیتا ہے۔یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا ہے۔"(33)

سارتر انسانی آزادی کے باب میں خدا کے انکار کو ضروری سمجھتا ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اہلِ مذہب خاص کر اہلِ کلیسانے یا تو خدا کا ایک ظالمانہ اور جابرانہ تصور اجاگر کیا ہے یا پھر ایک محدود تصور پیش کیا ہے۔سارتر کبھی بھی گوارا نہیں کرتا کہ انسانی آزادی کے معاملات میں خدا دخل دے اور انسان کے اختیارات کو محدود کر دے۔اگر انسانی فکر کو مذہب کے تحت محدود کرنے کی سعی کی جائے گی تو یہ انسان کے ساتھ ظلم کے مترادف ہو گی۔ڈاکٹر حیات عامر حسینی، سارتر کے اس وجودی پہلو کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"سارتر کے علم الوجود کا بنیادی مفروضہ خدا کا انکار ہے کیوں کہ تصورِ خدا یا اس کے وجود کا اثبات انسانی آزادی ،وجود اور شخصیت پہ ایک واضح حد لگاتا ہے اور اسے محدود کرتا ہے۔اگر خدا کے وجود کو مان لیا جائے تو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ذہن میں پوری کائنات کی طرح انسان کا بھی ایک واضح تصور ہو گا جس کے مطابق وہ اس کی ماہیت یا ذات کی تخلیق یا تنظیم کرتا ہے یہ اثبات اور اس کے منطقی نتائج انسان کی غلامی اور مجبوری کا واضح ثبوت ہیں۔انسان اس دنیا میں ایک بنی بنائی شے کی حیثیت سے نہیں آتا بلکہ وہی کچھ بنتا ہے جو وہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔"(34)

جرمن فلاسفر کارل جیسپرز انسانی آزادی اور خود مختاری کا بھرپور قائل ہے۔

"وہ وجودی خیالات کا حامل ہے اور ہر سطح پر فرد کی آزادی کا خواہاں ہے۔ وہ افراد کو ابلاغی سطح پر آزاد، خود مختار اور بااعتماد دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی فکری سطح کے کچھ اقوال مابعد الطبیعاتی ہیں۔"(35)

فرانسیسی فلاسفر مارلو پونٹی کے مطابق ہماری صورتِ حال کو ہماری آزادی تباہ نہیں کرتی بلکہ اس سے منسلک ہو جاتی ہے۔ گویا آزادی کی صورتِ حال سے انسلاک ہوتا ہے۔ بقول پونٹی:

"Our freedom does not destroy our situation, but is engaged with it."(36)

ڈاکٹر اقبال آفاقی آزادی اور آزادیِ انتخاب کی اہمیت کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"وجودیت فرد کے اختیار اور آزادیِ انتخاب پر زور دیتی ہے۔ فرد جب تک انتخاب نہیں کرتا اس وقت تک اپنی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ کرکیگور (Either-Or) میں لکھتا ہے کہ جو شخص انتخاب کرنے سے اجتناب کرتا ہے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور اس کی شخصیت استحکام سے محروم ہوتی ہے۔ انسان کی شخصیت صرف انتخاب کے عمل سے گزر کر تشکیل پاتی ہے۔"(37)

درج بالا اقتباس کے تناظر میں آزادیِ انتخاب فرد کی انفرادیت اور شخصیت کے استحکام کے لیے لازم ہے گویا آزادی سے فیصلہ کیے بغیر انسانی اپنی زندگی کو بہتر طور پر تشکیل نہیں دے سکتا۔ افتخار بیگ وجود کے لیے آزادی کو ناگزیر قرار دیتے ہیں:

"آزادی وجود کے لیے ناگزیر ہے۔ وجود آزاد ہے۔ یہ آزادی سوچ، فکر اور شعور سے لے کر سماجی اور معاشرتی اقدار اور زندگی کے نصب العین تک محیط ہے۔ زندگی کے مقاصد اور اقدار ہر فرد خود متعین اور مرتب کرتا ہے۔ فرد سے ورا کوئی قدر کوئی مقصد نہیں ہے۔"(38)

وجودی مفکرین کی آرا کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فرد کی آزادی بھرپور اہمیت کی حامل ہے۔ جس سے انسان اپنی قوتِ ارادی اور فیصلہ سازی کے مراحل سے گزر کر اپنی ذات کو اور کائنات کو تسخیر کرنے کی مہم سر انجام دیتا ہے اور

دے رہا ہے۔ آزادی انسان کے لیے لازم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انسان کو ذمہ داری اٹھانی ہو گی اور دوسروں کی آزادی کا خیال بھی رکھنا ہو گا۔ رہی کولن ولسن کی بات کہ لغو و لایعنی دنیا میں آزادی سے کیا کام لینا تو اس کی وضاحت یوں ہے کہ یہ رائے عدمیت اور لاشئیت کے فلاسفہ کے تناظر میں ہے یہ بجا ہو سکتی ہے لیکن جب تک انسان دنیا میں ہے اسے آزادی درکار ہے تاکہ اپنے فیصلے کرے، انتخاب کرے اور عمل کر کے اپنی زندگی کی بہتر تشکیل کرے۔ آزادی سزا ہے یا نہیں لیکن یہ طے ہے کہ آزادی ناگزیر ہے۔

ج: معاصر اردو غزل گو شعراء

معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں آزادی کا تصور ماضی کی بہ نسبت زیادہ شدت اور وسعت سے ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف انسانی مجموعی شعور عروج پر پہنچ چکا ہے اور دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے۔ نئی دنیائیں دریافت کی جا رہی ہیں اور انسانی عظمت اور رفعت میں اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری جانب غلامی اپنی صورت بدل کے تیسری دنیا کے ممالک کو اپنے حصار میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد اور سوشل میڈیائی عہد میں مغائرت کا احساس تیزی سے بڑھا ہے۔ معاشی، معاشرتی، سماجی اور مذہبی دباؤ اور جبر ہنوز بڑھتا جا رہا ہے۔ برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر سرسری سی نگاہ ڈالی جائے اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ہم عہدِ حاضر کے غزل گو شعراء کے تصور آزادی کی شدت اور وسعت کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں:

> "بیسویں صدی میں اردو غزل نے مفاہیم و معانی کے کئی چولے بدلے۔ یہ نعرے بازی سے اشارے بازی تک اٹھنے والی ہر آواز میں اپنی آواز ملاتی چلی گئی۔"(39)

مسلم حکمرانوں کی تاج و تخت کے لیے جنگیں، محکوم کا استحصال، انگریزوں کی آمد، غلامی کا راج، کسانوں اور محنت کشوں کی حق تلفی، مذہبی تقسیم، ہندو مسلم فسادات، ذات پات کے جھگڑے، لسانی تنافر، تہذیبی بیگانگی اور مذہب کے عتاب تلے دبے ہوئے معاشرے میں مزاحمتی رویہ اپنانے والے قیامِ پاکستان کے بعد بھی کچھ بہتری نہ دیکھ سکے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کی تصویر کشی شاہین مفتی نے کچھ یوں کی ہے:

" پاکستان اسی بحران سے ابھرا تھا، یہاں سیاست کی باگ ڈور ابھی تک انگریزی بولنے والوں کے ہاتھ میں تھی، یہاں کے تعلیمی نظام پر مغربیت کے سائے تھے، یہاں کے دفتری نظام پر مہاجر اہلِ زبان قابض تھے، یہاں کا جاگیر دار پہلے جیسا ہی تندرست اور توانا تھا، یہاں کے بندہ بے دام کے روز و شب بدلنے والا قادر و عادل خدا گہری نیند سویا ہوا تھا، یہاں کی مسجدیں سعودی امداد پر گزر بسر کر رہی تھیں، یہاں انڈسٹری کی کمی اور روزگار کی عدم دستیابی کے مسائل تھے۔ یہاں فقیہہِ شہر کی منافقتیں تھیں، چنانچہ ادیبوں اور شاعروں کے اندر رکے ہوئے جذبات اور اپنی کم حیثیتی کے احساسات نے وجودی خیالات و افکار میں پناہ ڈھونڈی۔"(40)

اگرچہ وجودیت کے پنپنے میں یہ کشت و خون اور افلاس سے اٹا پس منظر کافی ہے لیکن معاصر غزل گو شعراء کو صرف یہی پس منظر نہیں ملا بلکہ تقسیمِ ہند کے وقت لاکھوں جانیں اور عزتیں گنوا کر بھی ملنے والے ملک کا ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ تاریک اور خون آلود واقع ہوا۔ اپنے ہی ملک میں اپنے ہی لوگوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ مذہب کے نام پر ملک لے کر مذہبی مسائل پر کشت و خون کا بازار گرم کروایا گیا اور مسلکی جھگڑے پیدا کیے گئے۔ معاشی مسائل کا حل تو خیر کیا نکالتے اور بحران پیدا کرنے میں لگ گئے۔ جمہوری جماعت نے سرمایہ داری اور جاگیریت کو اپنا اولین فرض بنا لیا اور آمریت نے ملک میں ڈیرے ڈال لیے۔ بھلا ایسے ماحول میں آزادی کا سانس کہاں سے آتا؟ دنیا ترقی کا سفر طے کرتی گئی اور یہاں تنزلی کا سفر دگنی رفتار سے طے ہونے لگا۔ مذہبی آزادی مل سکی نہ معاشی، نہ جمہوری حق ملا نہ آمرانہ انصاف۔ ایسے حالات نے معاصر غزل گو شعراء کو بری طرح متاثر کیا چنانچہ انھوں نے مزاحمتی رویہ اپنایا۔ آمریت سے ٹکر لی، جمہوری اقدار کو پنپنے کے لیے راہ ہموار کرنے کی سعی کی اور وجود کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بھرپور آواز اٹھائی۔ انھوں نے مذہب اور وطن کے نام پہ لٹنے سے انکار کیا اور باطن کی اہمیت بیان کی۔

معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے حوالے سے مختلف تصورات ملتے ہیں۔ یہاں وجودیت کی صوفیانہ تعبیر اور الحادی تعبیر دونوں دبستانوں سے تعلق رکھنے والے شعراء موجود ہیں۔ فرد کی آزادی کو صوفیانہ تعبیر سے الحادی طرز پر اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آزادیِ انتخاب، آزادیِ عمل، انفرادیت، اجتماعیت، وجود کی اہمیت، باطن کی اہمیت اور مزاحمت کے حوالے سے خاطر خواہ مواد موجود ہے۔ ذیل میں ہم چیدہ چیدہ معاصر

شعراء کے چند اشعار وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے حوالے سے زیرِ بحث لائیں گے اور اگلے ابواب میں چار منتخب معاصر غزل گو شعراء(میر احمد نوید، صابر ظفر، قمر رضا شہزاد اور اختر عثمان) پہ تفصیلی بحث ہو گی۔

افتخار عارف عہدِ حاضر کے قد آور شاعر ہیں۔ وہ عمر کے جس حصے میں ہیں اپنے آپ میں ایک تہذیب اور ایک عہد ہیں۔ انھوں نے زمانے کے اتار چڑھاؤ خوب دیکھے ہیں۔ معاشی و معاشرتی جبر، آمریت، صنعتی انقلاب، آمرانہ طرزِ حکومت اور سرمایہ دارانہ طرزِ معیشت سبھی کے تیور افتخار عارف نے دیکھے اور برداشت کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں وجودیت کے عناصر اور فرد کی آزادی کے تصورات ابھر کے سامنے آتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے فرد کے مسائل اور اس کے وجود کو لاحق خطرات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

وقت نے ایسے گھمائے افق آفاق کہ بس

محورِ گردشِ سفاک سے خوف آتا ہے(41)

افتخار عارف کو فرد کی آزادی پہ جبر قبول نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ فرد کو اپنے فیصلوں میں آزاد ہونا چاہیے۔ فرد کو خود مختاری ملے تاکہ وہ اپنے فیصلے آپ کرے، خود انتخاب کرے اور آزادیِ عمل حاصل کرے لیکن بدقسمتی سے ان کے عہد کے افراد کو ایسی آزادی نصیب نہیں ان کے فیصلے دوسروں کے اختیار میں ہیں۔

چراغ کون سے بجھنے ہیں کن کو رہنا ہے

یہ فیصلے ابھی اوروں کے اختیار میں ہیں(42)

افضال نوید ایسے معاصر غزل گو شاعر ہیں جن کے ہاں فرد کی آزادی کے تصورات موجود ہیں اور کہیں کہیں وہ مزاحمتی انداز اپنائے ہوئے ملتے ہیں۔ جب بھی فرد کے حق پہ ڈاکا ڈالا جائے اور اس کے وجود کی بنیادی ضروریات سلب کی جاتی ہیں تو افضال نوید آواز اٹھاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر فرد کو اس کا حق ملے اور اس کے وجود کو قطعاً نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اپنی شعری تصنیف "مجھ پہ وجود آیا ہوا" میں افضال نوید کہتے ہیں:

خلق خدا کا حق جو کہیں اور جائے گا

چیخوں کا آسمان تلک شور جائے گا(43)

افضال نوید وجودی فکر کے حامل شاعر ہیں ان کے نزدیک فرد کو اپنے لیے سب آپ کرنا ہے نہ صرف اپنے لیے کرنا ہے بلکہ اوروں کی ذمہ داری بھی اٹھانی ہے اور ان کے کام بھی آنا ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کا امتزاج ان کے نزدیک بہت ضروری ہے۔ ایک فرد کا فیصلہ باقیوں کے لیے بھی فیصلہ ہے۔ چاہے کارپوریٹ سیکٹر کی بد دیانتی ہو یا آمرانہ طرزِ حکومت، جو بھی صورت ہو فرد کے وجود کو نقصان سے بچانا ہے اور اس ظلم و ستم کے خلاف اپنے اور دوسروں کے لیے چراغ جلانے ہیں۔

جہاں نہ جاسکے کوئی دیا جلایا کرو

جہاں نہ راہ ہو رستہ دکھایا کرو تم (44)

افضال نوید کے اس شعر میں احساسِ ذمہ داری بھی ہے، انفرادیت اور اجتماعیت کا امتزاج بھی ہے اور اعلیٰ مقصد کی رمق بھی موجود ہے جو کہ وجودی فلاسفہ کی فکر کے مطابق ہے۔

معاصر غزل گو شعراء میں تصورِ آزادی حوالے سے جاوید احمد کا شمار صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں فرد کی آزادی بنیادی مدعا کے طور پر ابھرتی ہے۔ وہ ایک طرف وطنِ عزیز میں ہونے والے سماج کے جبر، کارپوریٹ سیکٹر کی ناانصافیوں اور آمرانہ اطوار میں پستے ہیں تو دوسری طرف ریاستِ کشمیر کے دھانے آباد ہیں جہاں مظلوم کشمیریوں کی چیخ و پکار ان کے کان پڑتی ہے، جہاں فرد جسمانی طور پر غلامی تک پہنچا ہوا ہے، جہاں انتخاب و عمل کا اختیار تک چھینا جا چکا ہے۔ جاوید احمد ذاتی طور پر سمجھتے ہیں کہ جو شخص جہاں پیدا ہوا ہے اس خطے پر اس کا حق ہے وہ آزاد ہے اپنے فیصلے کرنے میں اور اپنے لیے انتخاب کرنے میں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ زبردستی اس پر قابض ہو سکے۔ ان نظریات کا اظہار ان کی شاعری کے علاوہ ان کے پہلے شعری مجموعے "دنیا کے منصفو" کے دیباچے میں بھی ملتا ہے۔ ان کی شہرت کی وجہ جو گیت بنا وہ بھی دراصل فرد کی آزادی کے حوالے سے تھا۔ وہ ریاستِ پاکستان کی آزادی کو بھی آزادی نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک تو صورتِ حال کچھ یوں ہے:

بس اِتنی سی مری تقدیر بدلی

کبھی زنداں کبھی زنجیر بدلی (45)

ان کے نزدیک سماجی جبر اس قدر مضبوط ہے کہ کوئی بھی در و دیوار کی ویرانی پر بولنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ یہاں زبان کاٹ دی جاتی ہے اور لوگوں کو سانس بھی اونچا لیتے ہوئے خوف لاحق ہوتا ہے۔

سانس کھینچے ہوئے سب لوگ یہاں ملتے ہیں

کون بولے در و دیوار کی ویرانی پر (46)

جلیل عالی کے ہاں بھی اظہار پہ بندش، آزادیِ عمل پہ پہرا اور آوازوں کے قتل کے خلاف بھرپور کلام موجود ہے۔ وہ فرد کی آزادی کو مقدم جانتے ہیں لیکن معاشرتی جبر سے پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی خدا کے نام پہ تلواروں کا بے نیام ہونا تو کبھی اقتدار کی ہوس میں، کبھی سرمایہ داری کے ذریعے غلامی کے بیج بونا تو کبھی آمریت کے ذریعے اظہار پر پابندی لگانا جیسے عوامل چاروں طرف بکھرے ہوں تو ایسے میں وجود ہی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ جلیل عالی بھی اپنے ہم عصروں کی طرح اسی جبر کا شکار ہیں۔ اپنے شعری مجموعے "عرضِ ہنر سے آگے" میں کہتے ہیں:

خواب ہی اپنا بچا لیں تو غنیمت ہے بہت

اور اس صورتِ احوال میں کیا کرنا ہے (47)

جب اس جبر کو انتہا تک پہنچتا دیکھتے ہیں تو باغیانہ روش اپنا لیتے ہیں اور مزاحمتی روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ جب جبر انتہا کو پہنچتا ہے تو بغاوت کو جنم دیتا ہے۔ ایسی ہی کوئی صورت جلیل عالی کے ہاں ملتی ہے جب باغیانہ اطوار اختیار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

تم زمیں پر جو خدا بنتے چلے جاتے ہو

کیا سمجھتے ہو بغاوت نہیں ہم کر سکتے (48)

معاصر غزل گو شعراء میں دلاور علی آذر کا شمار نوجوان نسل کے نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں وجودیت کے مختلف رنگ بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجودی فلاسفہ کے خاصے اثرات موجود ہیں۔ خاص کر فرد کی آزادی کے باب میں خاصا مواد موجود ہے۔ وہ کسی مقدر کو خاطر میں نہیں لاتے ان کا ماننا ہے کہ اٹھنے کے لیے قصد کرنا پڑتا ہے اور خود کو خود تعمیر کرنا پڑتا ہے مقدر کا سہارا تو کمزور اور کھوکھلے لوگ لیتے ہیں:

اٹھنے کے لیے قصد کیا میں نے بلا کا

اب لوگ یہ کہتے ہیں مقدر سے اٹھا میں(49)

دلاور علی آذر سمجھتے ہیں جو لوگ مقدر کے خوف سے جستجو کو ترک کر دیتے ہیں اور اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے ان کے لیے خودکشی کو حلال قرار دینا چاہیے:

اس کے لیے تو خودکشی آذر حلال ہو

کچھ بھی نہ کر سکے جو مقدر کے خوف سے(50)

دلاور علی آذر آزادی کے باب میں شب و روز کی پابندی کو بھی گوارا نہیں کرتے ان کے لیے آزاد فضائیں ہی زندگی ہیں وہ گرفتاروں کی آزادی کے لیے سراپا احتجاج ہیں۔ مزاحمت کی علامت بن جاتے ہیں اور شب و روز کی پابندی کے حصار کو بھی توڑنے کے خواہش مند ہیں:

کیوں چار عناصر ہیں پابندِ شب و روز

آزاد کیے جائیں گرفتار ہمارے(51)

معاصر غزل کے شاعر شاہین عباس کے ہاں وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے مختلف پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہاں فرد کی آزادی کا تصور کافی جاندار ہے۔ ان کی اپنے عہد پر پوری نظر ہے۔ وہ مزاحمت بھی کرتے ہیں تو انداز اس قدر جارحانہ نہیں اپناتے کہ شعری حسن مجروح ہونے لگے بلکہ وہ شاعرانہ آہنگ اور طنزیہ لہجے سے کام لیتے ہوئے فرد کی آزادی کو سلب کرنے والوں پہ وار کرتے ہیں اور اپنے حالات کو بیان کرتے ہیں۔

چلتے چلتے میں رکا ہوں یک دم

میری زنجیر خفا ہو گئی ہے(52)

شاہین عباس وجودی تقاضوں سے پوری طرح واقف ہیں وہ فرد کی داخلی اور خارجی دنیا سے شناسا ہیں۔ وجود کی ضرورتیں ان کی نظر میں ہیں اور جبر و ظلم کے ضابطے ان کے سامنے ہیں وہ وجودی فلسفے کا ادراک رکھتے ہیں اور ان کے کلام میں اس فلسفے کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

بھوک ستا نہیں رہی پیاس رلا نہیں رہی

صاحبِ روزگار کو واقفِ روزگار کر(53)

ظفر اقبال ایک عہد کا نام ہے۔ ان کی شاعری تجربات سے بھری پڑی ہے۔ وجودیت سے جدیدیت تک ایسا کیا ہے جو ان کے ہاں موجود نہیں ہے؟ سبھی رنگ بکھرے پڑے ہیں یہاں ہم صرف وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے تصور کے حوالے سے ان کے کلام سے ایک دو مثالیں لیتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی سنگینیوں سے واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جبر کے خلاف آواز اٹھانا ہو گی۔ مزاحمت اور احتجاج شاید آزادی کی پہلی سیڑھی واقع ہوں۔ جبھی تو کہتے ہیں:

غم کا چرچا تو کرو، زخم کو رسوا تو کرو

کیا خبر راہ پر آجائیں تقاضا تو کرو(54)

ظفر اقبال تمام تر ظلم و ستم اور مصائب کے باوجود امید رکھتے ہیں کہ ایک دن ظلم گھٹ جانا ہے، اندھیرے میں چراغ جلنے ہیں، پاؤں کی زنجیروں نے پگھل جانا ہے اور انسان کو آزادی نصیب ہونی ہے:

رات دیکھی ہے پگھلتی ہوئی زنجیر کوئی

مجھے بتلائے گا اس خواب کی تعبیر کوئی(55)

معاصر غزل گو شاعر ڈاکٹر عابد سیال کے شعری مجموعے "بے ستوں" میں ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ جنھیں وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے حوالے سے پرکھا جا سکے۔ عابد سیال کے ہاں وجودی فلسفے کی بھرپور چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ وہ فرد کی آزادی کے قائل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فرد نے اپنی دنیا آپ بنانی ہے۔ اپنے وجود کی تعمیر و تشکیل کے لیے کسی پر انحصار نہیں کرنا انسان ہی اپنا خدا ہے۔ اسی نے اپنی کائنات کی تشکیل کرنی ہے۔ آزادیِ انتخاب، آزادانہ فیصلوں اور آزادیِ عمل ہی سے انسان نے نمو پانی ہے۔ ان کی غزل کا مشہور مطلع ایسے ہی نظریات کی ترجمانی کرتا ہے:

کفِ خزاں پہ کھلا میں اس اعتبار کے ساتھ

کہ ہر نمو کا تعلق نہیں بہار کے ساتھ(56)

فرد کی آزادی کا تصور ان کے ہاں بڑا واضح ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ طبعِ شاعر موجود سے بے زار ہی رہتی ہے۔ فیصلوں اور انتخاب میں آزادی ان کی بنیادی ترجیحات میں شامل ہیں وہ باطن کی دنیا کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں اس کا انتخاب کرتے ہیں۔

گام بہ گام مشورے راست قدم کے ہجوم کے

سنتا ہوں ایک دل کی بات چنتا ہوں راستہ غلط(57)

عباس تابش عہدِ حاضر کے نام ور شاعر ہیں۔ ان کے شعری میلان مختلف ہیں لیکن ان کی کلیات "عشق آباد" میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جنھیں وجودیت کے تناظر میں رکھ کے دیکھا جاسکے۔ فرد کی آزادی کا تصور وہاں بھی موجود ہے اور مٹی سے جڑت کا جذبہ غالب ہے۔ ظلم سے ٹکرانے کا عزم اور کج ادائی ان میں بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے نزدیک وجود خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے نزدیک وجود جوہر پر مقدم دکھائی دیتا ہے۔ جو ان کی اڑان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان نظریات کی جھلک درج ذیل شعر میں دکھائی دیتی ہے:

یوں ہے مری اڑان پہ بھاری مرا وجود

جیسے زمیں بندھی ہو مرے بال وپر کے ساتھ(58)

وہ فرد کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو ناپسند کرتے ہیں اور خواہش رکھتے ہیں کہ فرد آزاد ہو اور رکاوٹیں ہٹ جائیں لیکن ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ انھیں لگتا ہے کوئی آسیب ہر وقت فرد پہ مسلط ہے۔ جو اسے آزاد نہیں رہنے دیتا۔ بڑی عمدہ تشبیہ کا استعمال کرتے ہوئے وہ اپنے ان نظریات کا ابلاغ کرتے ہیں:

نہ میرے سر سے سرکتا نہ چھاؤں دیتا ہے

یہ کون مجھ پہ مسلط ہے آسماں کی طرح(59)

معاصر غزل گو شاعرہ کشور ناہید کے ہاں فرد کی آزادی کا تصور زیادہ شدت کے ساتھ نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ایک تو یہاں فرد آزاد نہیں اوپر سے اس معاشرے میں عورت ہونا ایک اور ہی طرح کا مسئلہ ہے۔فرد بندشِ اظہار کا شکار تو ہے ہی لیکن عورت پر مرد سے زیادہ پابندیاں عائد ہیں۔کشور ناہید صاحبہ کی شاعری فرد کی آزادی کے باب میں خاص کر عورت کے حق میں خاصے کی چیز ہے۔انھوں نے آزادی کے تصور کو وسعت بخشی ہے اور عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی ہے۔ان کی شہرت یافتہ نظم "ہم گنہگار عورتیں" جبر کے خلاف ایک توانا آواز ہے۔غزل میں انھوں نے آزادیِ انتخاب و عمل پر زور دیا ہے۔وہ بندشِ اظہار پر سخت نالاں ہیں۔ایسے حالات کی عکاسی ان کے ہاں جابہ جا دکھائی دیتی ہے:

اب اجازت ہی کہاں ہم کو سخن کرنے کی

بولنے کے لیے کوشش نہیں کی جاسکتی(60)

کشور ناہید زمیں پہ ہونے والے مظالم اور ان کے نتیجے میں ہونے والی آہ و بکا کی منظر کشی کچھ یوں بیان کرتی ہیں:

زمیں پہ آہ و بکا اور خونِ ناحق بھی

زبانِ خلق یہ پوچھے ہے کیا خدا نہیں ہے؟(61)

درج بالا مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے باب میں خاصا مواد موجود ہے۔معاصر شعراء وجودی فلسفہ سے واقف ہیں اور ان نظریات کا اظہار اپنے کلام میں جابہ جا کرتے ہیں۔اردو غزل میں وجودیت کے ابتدائی نقوش ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء کے ہاں ملتے ہیں اور پھر یہ سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔جیسے جیسے جبر بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے مزاحمت بھی بڑھتی ہے اور فرد کی آزادی کے لیے آواز اٹھنے لگتی ہے۔وطنِ عزیز کے حالات جس قدر دگرگوں رہیں گے اس قدر فرد کے وجود کو اور اس کی آزادی کو نقصان پہنچے گا۔

حوالہ جات

1۔ جاوید، قاضی، وجودیت، فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور، طبع اول ۱۹۹۸ء، ص ۱۴

2۔ بختیار حسین صدیقی، پروفیسر، وجودیت کیا ہے؟، وجودیت، قاضی جاوید، فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور، طبع اول ۱۹۹۸ء، ص ۱۵

3۔ جاوید، قاضی، وجودیت، ص ۱۴

4۔ سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اردو اکادمی، اترپردیش، لکھنو، طبع اول ۱۹۷۸ء، ص ۹

5۔ قاضی جاوید، وجودیت، ص 9

6۔ سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اردو اکادمی، اترپردیش، لکھنو، طبع اول ۱۹۷۸ء، ص ۱۰

7۔ جمیل اختر محبی، ڈاکٹر، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اول ۲۰۰۲ء، ص ۲۲

8۔ سی-اے قادر، ڈاکٹر، وجودیت، مشمولہ: ادب، فلسفہ اور وجودیت، مرتبہ: شمیا مجید، نعیم احسن، نگارشات، لاہور، طبع اول ۱۹۹۲ء، ص ۸۲ے

9۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، مترجم: قاضی جاوید، مشعل گارڈن ٹاؤن، لاہور، س ن، ص ۱۶

10۔ ایضاً، ص ۱۷

11۔ ایضاً، ص ۱۷

12۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، ص ۴۲

13۔ ایضاً، ص ۱۳

14۔ ایضاً، ص ۱۷

15۔ ایضاً، ص ۱۸

16۔ ایضاً، ص ۳

17۔ ایضاً، ص ۴۲

18۔ ایضاً، ۳۸

19۔ ایضاً، ص ۴۱

20۔ جاوید، قاضی، وجودیت، ص ۶۷

21۔ نظیر صدیقی، کولن ولسن، ایک تعارف، وجودیت، از جاوید، قاضی، فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور، طبع اول ۱۹۹۸ء
، ص ۱۱۱

22۔ جاوید، قاضی، وجودیت، ص ۳۳

23۔ سلطان علی شیدا، ص ۳۳

24۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، ص ۲۸

25۔ ایضاً، ص ۲۹

26۔ ایضاً، ص ۳۵

27۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ فلسفہ، خرد افروز، جہلم، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۶

28۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، ص ۲۵

29۔ سلطان علی شیدا، ص ۴۰

30۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، ص ۲۹

31۔ ایضاً، ص ۱۵۲

32۔ ایضاً، ص ۲۳

33۔ بختیار حسین صدیقی، وجودیت کیا ہے؟ مشمولہ: وجودیت، مرتبہ: جاوید اقبال، وکٹری بک بینک، ساہیوال، طبع اول ۱۹۸۹ء، ص ۴۳

34۔ حیات عامر حسینی، ڈاکٹر، وجودیت، بتول پبلی کیشنز، سری نگر، طبع دوم ۱۹۹۱ء، ص ۱۶۸

35۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاؤالدین زکریا، یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴

36۔ مارلو پونٹی، جدید اردو نظم میں وجودیت، از شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاؤالدین زکریا، یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸ء، ص 29

37۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت فلسفہ وتاریخ کے تناظر میں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، طبع اول ۲۰۱۳ء ص ۱۳۶

38۔ افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفۂ وجودیت، مقالہ برائے ایم۔ فل، اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۹

39۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، مرتب، غزل کا مقدمہ، غزل آباد، قدوسیہ اسلامک پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۰۶ء، ص ۱۰

40۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، ص ۳۵

41۔ افتخار عارف، حرفِ بارباب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اول ۱۹۹۴ء، ص ۳۳

42۔ ایضاً، ص ۴۶

43۔ افضال نوید، مجھ پر وجود آیا ہوا، بک ہوم، لاہور، طبع اول ۲۰۱۹ء، ص ۷۸

44۔ ایضاً، ص ۸۱

45۔ جاوید احمد، مٹی کا شجر، ایسٹرن پبلشرز، لاہور، طبع اول ۲۰۱۶ء، ص ۳۲

46۔ ایضاً، ص ۵۲

47۔ جلیل عالی، عرضِ ہنر سے آگے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۷ء، ص ۴۸

48۔ ایضاً، ص ۶۵

49۔ دلاور علی آذر، مآخذ، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اول ۲۰۱۶ء، ص ۴۸

50۔ ایضاً، ص ۴۱

51۔ ایضاً، ص 39

52۔ شاہین عباس، خدا کے دن، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اول ۲۰۰۹ء، ص ۶۳

53۔ ایضاً، ص ۳۲

54۔ ظفر اقبال، آبِ رواں، شاہی پریس، لکھنو، طبع اول ۱۹۷۸ء، ص ۲۵

55۔ ایضاً، ص ۳۳

56۔ عابد سیال، بے ستوں، پریمئیر پریس، راولپنڈی، طبع اول ۲۰۱۴، ص ۲۳

57۔ ایضاً، ص ۵۶

58۔ عباس تابش، عشق آباد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول ۲۰۱۱ء، ص ۷۰

59۔ ایضاً، ص ۲۳۵

60۔ کشور ناہید، آباد خرابہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول ۲۰۱۶ء، ص ۸۷

61۔ ایضاً، ص ۱۰۶

بابِ دوم: منتخب معاصر اردو غزل گو شعرا کے ہاں آزادیِ انتخاب اور سوچ کے عناصر

الف: فرد کی آزادی اور آزادیِ انتخاب

وجودیت کا زور فرد کی آزادی، اس کے اختیار اور آزادیِ انتخاب پر ہے۔ وجودیت کے نزدیک شخصی استحکام اور اپنی حقیقت کو پانے کے لیے فیصلہ کرنا اور انتخاب کرنا لازم ہے۔ آزادیِ انتخاب کا علم بردار سارتر اپنی ذات کے انتخاب کے بغیر خود کو غیر مستند اور نامکمل خیال کرتا ہے وہ شخصی تکمیل و تشکیل کے لیے خاص نقطۂ نظر کو منتخب کرتا ہے جس سے اپنی زندگی کو تبدیل کر سکے۔ فرد کی آزادی اور آزادیِ انتخاب کے باب میں ڈاکٹر اقبال آفاقی لکھتے ہیں:

> "وجودیت کا دعویٰ ہے کہ زندگی وہ بھاری زنجیر ہے جو بالجبر ہمارے گلے میں ڈال دی گئی ہے۔ اس لیے ایک خاص نقطۂ نظر کو اپنانا ہماری مجبوری ہے۔ اس نقطۂ نظر کو وہ انتخاب اور (Commitment) کا نام دیتے ہیں۔ انتخاب کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم آزاد ہوں۔ جب ہم آزادانہ فیصلے کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ یہ آزادی ہمیں دنیا کے وقوف اور شعور کی وسعت سے حاصل ہوتی ہے۔ آزادی انسان کو برتر موقع فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کو معنی خیز بنا سکتا ہے۔"(1)

معاصر اردو غزل میں فرد کی آزادی، خود مختاری اور آزادیِ انتخاب سے متعلق وافر مواد موجود ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہمارے موجودہ حالات اور ہمارے اس خطے کا پس منظر ہے جو وجودیت کی تحریک کے پس منظر سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ نہ ہمارے حالات بدلتے ہیں نہ ہمارے موضوعات بدلتے ہیں۔ گزشتہ دو تین صدیوں سے برصغیر پاک و ہند کے مسائل میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ جبر بڑھتا جا رہا ہے بندشیں لگتی جا رہی ہیں اظہار یہ پابندی کی کئی صورتیں موجود ہیں۔ نہ سوچ کی آزادی ہے، نہ اظہار کی آزادی ہے اور نہ ہی انتخاب و عمل کی آزادی ہے۔

جس طرح سارتر اور اس کی قوم غلامی اور بندشوں کے زمانے میں آزادی کی طرف لپکے تھے ویسے ہی ہمارے معاصر غزل گو شعراء آزادی اور آزادیِ انتخاب سے متعلق آواز اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ جبر ہی میں آزادی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

تقسیم ہند سے قبل بھی ظلم و بربریت کا بازار گرم تھا اور قیام پاکستان کے بعد بھی ظلم و ستم اور بندشِ اظہار کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ آمریت، جمہوری آمریت، صنعتی جبر اور سرمایہ داریت نے انسانی آزادی اور انسانی وجود کو نقصان پہنچایا اور پہنچاتے ہی جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر شعراء کو انسانی وجود اور آزادیِ انتخاب کی فکر لاحق ہے۔

ہمارے منتخب معاصر شعراء میر احمد نوید، صابر ظفر، قمر رضا شہزاد اور اختر عثمان کے زیرِ بحث موضوع سے متعلق بے شمار اشعار ملتے ہیں جہاں وہ فرد کی آزادی، خود مختاری اور آزادیِ انتخاب سے متعلق گویا ہوتے ہیں۔

معاصر غزل گو شعراء میں میر احمد نوید ایسے شاعر ہیں جو پوری طرح وجودی اساس رکھتے ہیں ان کے شعری مجموعوں کے ناموں سے ہی ان کے وجودی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ "وجود"، "موجود"، "ہاں اور نہیں کے درمیان"۔ وہ وجودیت میں فرد کی آزادی کے علم بردار ہیں۔ وہ کسی مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی بندش کو اہمیت نہیں دیتے ان کے نزدیک ہر کسی کی خودی اور خدا اپنا اپنا ہے۔ کسی خدا کے ایک ہونے پہ کوئی جھگڑا نہیں، کوئی معاشرتی اور مذہبی بندش نہیں۔ عقل سے خدا کا ہونا یا نہ ہونا ثابت نہیں۔ حقیقت انسانی وجود ہے جو اس بے کراں جہاں میں موجود ہے اسے اب اپنی بقا کے لیے لڑنا ہے کسی خدا نے کسی ناخدا نے اس کی مدد نہیں کرنی وہ اپنے ارادوں، فیصلوں اور اعمال میں آزاد ہے اور اسے آزاد رہنا چاہیے۔ بقول میر احمد نوید:

کرو ختم جھگڑا، نشہ اپنا اپنا

خودی اپنی اپنی خدا اپنا اپنا

سوال اپنے اپنے جواب اپنے اپنے

یہ کیوں اپنا اپنا یہ کیا اپنا اپنا

ثبوت اپنے ہونے کا دینا ہے سب کو

جلانا ہے سب کو، دیا اپنا اپنا(2)

آزادیِ انتخاب کے باب میں سارتر نے ایک نکتہ اٹھایا کہ انتخاب نہ کرنا بھی ایک انتخاب ہی ہے(وجودیت اور انسان دوستی، ص۳۵) بالکل اسی طرح میر احمد نوید بھی یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں کوئی فیصلہ کرنے میں وہ مزید آزادیِ انتخاب کو واضح کرتے ہیں کہ انسانی فطرت میں اس کی انا بھی پوشیدہ ہے۔ اگر کوئی بات اس کی انا کے خلاف ہو تو وہ آزاد ہے کہ پھر وہ کام کرے یا نہ کرے ان دونوں صورتوں کو میر احمد نوید نے اپنے اشعار میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

ایک ہی فیصلہ کیا ہم نے

یعنی کوئی بھی فیصلہ نہ کیا

جب کوئی کام ہم کو حکم لگا

ہم نے وہ کام باخدا نہ کیا(3)

دنیا وہ گلشن ہے جہاں بلبل آزاد بھی ہے اور پابند گل بھی۔ انھی پابندیوں میں آزادی حاصل کرنی ہے۔ میر احمد نوید کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ آزادی کے خواہاں تو ہیں لیکن جس معاشرے میں مقید ہیں وہاں سانس لینا بھی کارِ محال ہے۔ انسان کو مناسب آزادی میسر نہیں۔ ایسے گھٹن زدہ ماحول میں کیا آزادی اور کیا آزادیِ انتخاب؟

ادھڑ گیا مرا سینہ اکھڑ گیا مرا دم

سوائے عمر میں سانس استوار کرتے ہوئے

رگِ گلو سے میں خنجر کو کاٹ سکتا تھا

یہ اختیار تھا صبر اختیار کرتے ہوئے(4)

انسان کے اختیار وسیع تر ہو کے بھی محدود ہیں۔ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ ایسا وہ کچھ نہیں جانتا اسے موت کا خوف لاحق ہے اس کے اختیار میں نہیں کہ موت کو شکست دے سکے کچھ اختیار دنیا میں آتے ہی اس کے پاس نہیں تھے اور باقی دنیا والوں نے چھین لیے میر احمد نوید اس پہ بہ ضد ہیں کہ دنیا والے ان کے اختیارات کو محدود نہ کریں تاکہ وہ اس وسیع کائنات میں اپنے ہونے یا نہ ہونے کو سمجھ سکیں خدا کا سراغ پا سکیں لیکن یہ کیا کہ زندہ رہتے ہوئے بھی زندگی کے اختیارات چھین لیے جائیں۔

میر احمد نوید خود اعتمادی کے قائل ہیں۔ وہ اپنی ذات پر انحصار کرتے ہیں اور خود پر ہی اعتبار کرتے ہیں وہ دوسروں پر انحصار نہیں کرتے بلکہ اپنے فیصلے آپ کرتے ہیں اور انھیں آپ ہی سر انجام دیتے ہیں۔ وہ نہ تو کسی دوسرے انسان پر انحصار کرتے ہیں نہ ہی کسی ماورائی طاقت پر وہ جانتے ہیں کہ اس جہان میں وہ خود ہی اپنے مسیحا ہیں:

جب سفر کوئی اختیار کیا

اپنے سائے پہ انحصار کیا

سب نے رد کر دیا تو پھر میں نے

اپنے ہونے کا اعتبار کیا(5)

فرد کی آزادی میں سوچ کے عناصر بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ فرد کی آزادی کا بنیادی محرک اس کی ذہنی آزادی ہے۔ خیال آزاد ہوں گے تو وجود کی آزادی کا سوچیں گے۔ معاشرتی جبر جسموں پہ اثر انداز تو ہوتا ہے لیکن وہ خیال اور سوچ کو قید کرنے سے قاصر ہے۔ میر احمد نوید کہتے ہیں:

نہیں وہ دام نہیں جس میں ہو خیال آزاد

خیال کو جو کرے قید دام وہ ہو گا(6)

میر احمد نوید کے کلام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وجودیت کے الحادی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ان دیکھے خدا کی کوئی گنجائش نہیں ہے وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی آزادی اور خود مختاری کا یہ تقاضا ہے کہ ان دیکھے خدا سے جان چھڑا لی جائے جب تک مذہبی خدا کی تلوار سر پر لٹکتی رہے گی تب تک انسان آزاد اور خود مختار نہیں ہو سکتا ان کے نزدیک انسان ان دیکھے خدا سے جان چھڑانے میں لگا ہوا ہے۔ یہ کارِ مشکل ہے لیکن ایک نہ ایک دن آسان ضرور ہو جائے گا۔ اُن کے نزدیک حیرانی سے سوال اٹھتے ہیں اور سوال اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ انسان اپنے ہونے کے اقرار اور خدا کے انکار تک پہنچ جاتا ہے۔

چھڑا لے گا یہ انساں جان ان دیکھے خدا سے بھی

کوئی بھی کام مشکل کے بنا آساں نہیں ہوتا

سوال اب تک اٹھے ہیں جتنے حیرانی سے اٹھے ہیں

پہنچتا میں یہاں کیسے اگر حیراں نہیں ہوتا(7)

میر احمد نوید سمجھتے ہیں کہ انسان کے اندر ہی سب راز پوشیدہ ہیں باہر سے یا اوپر سے کوئی انسان کو ہدایات نہیں دیتا انسان کی قید میں ہی اس کی رہائی پوشیدہ ہے۔ وہ جب چاہے خود کو آزاد کرا سکتا ہے:

کھلا مجھ پہ جب میں بے بسی سے اپنی گزرا ہوں

کہ میری قید کے اندر ہی پوشیدہ رہائی ہے(8)

وجودیت کے تناظر میں آزادی اور آزادیِ انتخاب کے معاملہ میں معاصر غزل گو شاعر صابر ظفر عہدِ جبر کے نوحہ گر ہیں، مزاحم ہیں اور بندشِ اظہار کے خلاف آواز اٹھانے والے ہیں۔ ان کے ہاں سیاسی و سماجی بندشوں، جبر اور انسانی آزادی کے خلاف ہونے والے تمام اقدامات کی بھرپور مزاحمت ملتی ہے۔ قیامِ پاکستان سے اب تک کے حالات کا جائزہ لے کر صابر ظفر کہتے ہیں:

جلا دیا ہے اگر آپ نے قفس میں چراغ

تو کیا سمجھ لیں؟ ہمیں مل گیا سحر کا سراغ

سنا تو ہے کہ پرندے کبھی چہکتے تھے

سنا تو ہے کسی آزاد سلطنت میں تھے باغ

صدا نہ آتی تھی کوئی کسی بھی خیمے سے

سوائے اس کے کہ پیاسوں کے ٹوٹتے تھے ایاغ

ہیں زندہ اپنے مکانوں میں جانے کب تک ہم

بھرا ہوا ہے رعونت سے پاسباں کا دماغ(9)

آزاد سلطنت میں باغ ہوں تو پرندے چہکتے ہیں۔ قفس میں چراغ جلانے سے سحر نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب زاغ فاختاؤں کے گھونسلے گرا رہے ہیں۔ جب پاسبان مکانوں پہ قابض ہو جائیں تو زبانوں ہی کی نہیں جانوں کی فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ تب خیمے سے پیاسوں کو آواز لگانے کی جسارت نہیں ہوتی صدا آئے بھی تو پیالے ٹوٹنے کی آتی ہے۔ یہ ہے عہدِ حاضر کے شاعر کا حالات حاضرہ کی قدغن پہ نوحہ یہاں نہ صرف آزادیِ انتخاب پہ پابندی ہے بلکہ آزادیِ اظہار کی اجازت بھی نہیں وجودیت اسی جبر کے خلاف انسانی وجود اور انسانی آزادی کی آواز بن کر ابھرتی ہوئی تحریک ہے۔ بقول صابر ظفر:

باقی ہے دل میں جہدِ مسلسل کی آرزو

اور روبہ رو ہیں دار و رسن، وامصیبتا

لکھا ہوا کلام ہے، پڑھ لیجیے ظفر

ممکن نہیں ہے کوئی سخن، وامصیبتا(10)

وجودیوں کے مطابق زندگی جبراً ہمارے گلے میں ڈال دی گئی ہے تو ایسے میں کسی نقطۂ نظر کا انتخاب کرنا ہماری مجبوری بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان خونی حالات میں صابر ظفر بھی انتخاب کرتے ہیں۔ وہ آزاد ہیں یہ فیصلہ کرنے میں کہ سر جھکانا ہے یا کٹانا ہے۔

خون بہتا تو رہا مجھ کو مگر کہتا رہا

جسے جھکنا نہیں آتا وہی سر کٹتا ہے

روح پرواز کرے اب قفس عنصری سے

بات کرتا ہوں جو اڑنے کی تو پر کٹتا ہے(11)

وجودیت کا ماننا ہے کہ انسانی وجود کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ اس کی داخلیت پہ توجہ دی جائے اور فرد کی آزادی کو یقینی بنایا جائے۔ انسان کو آزادیِ انتخاب کا موقع ملنا چاہیے تا کہ وہ انتخاب کر کے اپنی زندگی کو تبدیل کر سکے۔ معاصر غزل گو شاعر صابر ظفر کے ہاں آزادیِ انتخاب کا رجحان بڑی شدت سے موجود ہے۔

نہیں ہے نغمہ گری گرچہ روح کی غماز

مگر وہ منع کرے گا تو گنگناؤں گا اور

قدم جما کے رکھوں گا جہاں بھی رکھوں گا

سہارا دے گا اگر کوئی، لڑکھڑاؤں گا اور

ظفر دوبارہ جلا تو جلوں گا بہتر میں

خود اپنے آپ کو اس واسطے بجھاؤں گا اور (12)

خود پابہ جولاں ہوں تو دوسروں کو آزادی نہیں دلوائی جا سکتی ہے لیکن انسان کی آزادی سے متعلق سوچا ضرور جا سکتا ہے سوچ کے عناصر ہی آزادی انتخاب تک لے جاتے ہیں۔ بقول صابر ظفر:

ہمارے ہوتے ہوئے بھی ہیں قید، کشمیری

رہا کرائیں انھیں کیا، ہم آپ زنجیری (13)

یہی وہ کشت و خون اور جبر کی فضا ہے جو وجودیوں کی فکر کو جلا بخشتی ہے۔ فرد کی آزادی پہ قدغن ہی آزادی کے لیے آواز اٹھانے کا محرک بنتی ہے۔ کسی سارتر کو وجودیت اور انسان دوستی تحریر کرنے پہ مجبور کرتی ہے اور کسی صابر ظفر سے یہ کہلواتی ہے:

ایک عریاں وجود، ایک بے جاں وجود

پھر بھی شکوہ کہ اذنِ تماشا نہ دے

انتہا جبر کی، انتہا صبر کی

آخری سانس کو بھی سنبھالا نہ دے

زندگی بے شناخت، ایک ننھی پری

کوئی آنکھیں نہ دے کوئی چہرہ نہ دے

اب صفِ دشمناں بڑھ کے چیر و ظفر

یہ زمانہ تو جینے کا رستہ نہ دے(14)

درج بالا غزل کی فضا لہو لہو ہے۔ کرب ناک چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ دل خراشی اور دل گدازی ہے۔ جب ایسے غم آلام اور لہو سے تر حالات ہوں تو انسان آزادی اور آزادیِ انتخاب کی اہمیت سمجھتا ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے فیصلہ کرنے اور راستے کا انتخاب کرنے کے لیے، کسی ایک نقطۂ نظر کو اپنانے کے لیے راستہ ڈھونڈنے کے لیے یہی وجہ ہے کہ صابر ظفر اس سوگوار غزل کے مقطع میں فیصلہ کرتے ہیں۔ صفِ دشمناں کو چیر کر آزادی حاصل کرنے کا ہنر وہ جانتے ہیں کہ زمانہ ایسے راستہ نہیں دے گا۔ یہی انتخاب کی آزادی ہے جس سے وہ اپنی زندگی تبدیل کر سکتے ہیں۔ فرد کی آزادی اور آزادی اظہار کی بندش کے حوالے سے صابر ظفر کہتے ہیں:

مکالمے کا وہاں دے رہے ہو مشورہ مجھ کو

جواب سن کے جہاں مار دے سوال کنندہ(15)

صابر ظفر کے ہاں ایک پر کا بھی اڑ کر قفس کے باہر پہنچنا آزادی کی ابتدا ہے۔

سمجھنا اس کو ظفر ابتدائے آزادی

قفس کے پار، اگر اڑ کے ایک پر بھی گیا(16)

صابر ظفر اس عہد میں انسانی آزادی کے علم بردار ہیں جس عہد میں بولنے والوں کی زبانیں کھینچ لی جاتی ہیں اور مثلِ نہنگِ تشنہ لہو کی لہریں کھینچی جاتی ہیں۔

وہ نور آنکھوں سے جسموں سے جان کھینچتے ہیں

جو بولیں ہم تو ہماری زبان کھینچتے ہیں

وہ کھینچتے ہیں ہمارے لہو کی یوں لہریں

نہنگِ تشنہ جو آبی نشان کھینچتے ہیں(17)

فرد انتخاب کے مرحلے سے گزر کر اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کو انجام تک پہنچاتا ہے۔ ظاہر ہے اپنی انفرادیت قائم کرنے اور انتخاب کی آزادی حاصل کرنے کے لیے مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور کرب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مختلف سرمایہ دارانہ ادارے، عالمی سامراج اور کارپوریٹ سیکٹر جب اپنے مفاد کے حصول کے لیے دوسروں کی آزادی سلب کرتے ہیں تو وجودی نقطہ نظر کے حامل لوگ اپنے اور اپنے جیسے انسانوں کے وجودی تقاضوں کا مدعا اٹھاتے ہیں اور مزاحمت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ صابر ظفر بھی انھی میں سے ایک ہیں جو آزادیِ خیال کے محور کر بیچنے کے لیے کسی طور تیار نہیں۔ وہ آزادیِ اظہار و انتخاب پہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنے بیالیسویں شعری مجموعے "دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں" میں کہتے ہیں:

سودا نہ کیجیو، کبھی اپنے وجود کا

یعنی کسی بجار کے بھیتر نہ بیچیو

یہ آخری اثاثہ ہے گویا تمھارے پاس

آزادیِ خیال کا محور نہ بیچیو(18)

فرد کی آزادی اور آزادیِ انتخاب سے متعلق وافر کلام معاصر غزل گو شاعر قمر رضا شہزاد کے ہاں موجود ہے۔ قمر رضا شہزاد انتخاب کی آزادی کے بے حد قائل ہیں اور اپنی زندگی میں لحہ لحہ انتخاب کرتے ہیں اور اپنے فیصلوں سے اپنی زندگی کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لکیر کے فقیر نہیں بنتے بلکہ جس رستے پر سب چل رہے ہوں وہ اس سے ہٹ کر اپنے لیے نئے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ وجودیت کا یہی تصور ہے کہ فرد کو مشین نہ بنایا جائے بلکہ اسے آزاد رکھا جائے تا کہ وجودی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تشکیل و نمو پہ بھی توجہ دے سکے۔ بقول قمر رضا شہزاد:

رواں تھے جس پہ سبھی وہ لکیر چھوڑ چکا

قدیم راستہ کب کا فقیر چھوڑ چکا(19)

وجودیت میں الہیاتی نقطہ نظر ہو یا الحادی مرکز انسانی وجود ہے اور اس نے اپنی وجودی ضرورتوں کے تحت ہی ماحول تشکیل دینا ہے۔ اس تشکیل کے دوران اور اپنی ذات کی کھوج میں کئی ایسے مقامات آتے ہیں جہاں آسمانی نظریات کو نظرانداز کر

کے اپنے تئیں اپنی دنیا کو ہموار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قمر رضا شہزاد بغیر کسی الہامی ہدایت یا کسی اور جبر کو رد کرتے ہوئے کسی اور کے مطابق دنیا بنانے کی بجائے اپنی دنیا اپنے مطابق بنانے کی بات کرتے ہیں یہی ان کا انتخاب ہے اور ضرورت بھی ہے۔

مجھ سے بنتی ہی نہیں تیرے مطابق دنیا

میں اسے اپنے مطابق تو بنالیتا ہوں(20)

ہارون الرشید تبسم کے مطابق:

"اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سچ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ رنگ خوشبو بن جائے تو وہ اپنا رستہ خود تراشتی ہے۔ دار و رسن کے خوف سے بالاتر جراتوں کے سفینے کا شناور قمر رضا شہزاد بے خوف و خطر منزل کی طرف رواں ہے وہ اچھے دنوں کا خواہش مند ہے۔"(21)

قمر رضا شہزاد دوستاں کے ہزار پیچ و خم سے اور لا مکاں سے ہوتے ہوئے مکاں تک آتے ہیں۔ خدا انتظار میں ہے تو کیا انھیں صفِ گمرہاں سے ہو کے آنا ہے کیوں کہ انھیں آزادی حاصل ہے انتخاب کی اور اپنی تکمیل اپنی مرضی سے کرنے کی۔

مجھے خبر ہے خدا مرے انتظار میں ہے

میں آرہا ہوں صف گمرہاں سے ہوتے ہوئے

کئی زمانوں کے اسرار پار کرنے پڑے

میں اپنے آپ تک آیا کہاں سے ہوتے ہوئے(22)

قمر سنگ کو آئینہ بنانے کے دعوے دار ہیں۔ انھیں عزم ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور ہنر سے اپنی مرضی اور انتخاب سے یہ کام سر انجام دے سکتے ہیں۔ سنگ پھینکنے والوں پہ واپس سنگ بار کی جا سکتی ہے لیکن اس کا انتخاب قمر رضا شہزاد نے کرنا ہے کہ وہ سنگ کے بدلے سنگ پھینکیں گے، معاف کریں گے یا کوئی اور قدم اٹھائیں گے۔

ضرور میری سمت سنگ پھینکیے

میں ان سے اک آئینہ بناؤں گا(23)

وجودی مفکرین، خاص کر سارتر کا یہ ماننا ہے کہ ہم اس جہانِ رنگ و بو میں پھینکے گئے ہیں ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانا ہے؟ ہم کچھ نہیں جانتے۔ البتہ یہ طے ہے کہ ہم نے اس دنیا میں رہنا ہے اور اپنی ضرورتوں کو آپ پورا کرنا ہے۔ اہلِ زمیں نے اپنے فیصلے آپ کرنے ہیں اور اپنی دنیا آپ بنانی ہے۔ اسی تناظر میں عہدِ حاضر کے غزل گو قمر رضا شہزاد اپنے شعری مجموعے "خامشی" میں کہتے ہیں:

بہت بڑی ہے تری کائنات اے خالق

سو میں یہاں کوئی جائے امان ڈھونڈ لوں گا

میں اپنی موج میں آیا تو دیکھنا اک روز

ترے جہان سے بہتر جہان ڈھونڈ لوں گا(24)

فرد آزادی سے اپنے فیصلے کرتا ہے اور اسے کرنے بھی چاہییں لیکن بے لگامی کی حد تک آزادی مسائل کا باعث بنتی ہے۔ اس بحث میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اگر ہر شخص اپنے فیصلوں میں آزاد ہے تو کیا وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے فیصلے بھی کر سکتا ہے؟ یقیناً کر سکتا ہے تو اسی ضمن میں وجودیوں کا کہنا ہے کہ انسان کو ذمہ دار ہونا ہو گا۔ اسے یہاں رہنے کی اور اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری قبول کرنی ہو گی۔ اسے اپنے فیصلوں میں دوسروں کا خیال رکھنا ہو گا و گرنہ بنی بنائی دنیا تباہ ہو جائے گی۔ اس ضمن میں قمر رضا شہزاد کے اشعار اہمیت کے حامل ہیں جہاں وہ اپنے انتخاب کے ساتھ ساتھ اس بے لگامی کی طرف بھی واضح اشارہ کرتے ہیں۔

بن تو سکتی ہے کائنات نئی

کیا کروں خود ہی میں بناتا نہیں

کر رہا ہوں تباہ تیرا جہاں

اے خدا کیوں مجھے ہٹاتا نہیں(25)

وجودیت میں مکتبِ سارتر کا مقدمہ یہ ہے کہ انسان ذمہ دار ہے اس نے اپنے لیے سب خود کرنا ہے۔ وہ آزاد ہے اپنے فیصلوں میں، آزادی انسان کی سزا ہے کہ اس کے فیصلوں کا بار اسی پہ ہے۔ اسے ذمہ داری اٹھانی ہے اپنے ہر عمل کی، انتخاب کی، فیصلے کی اور اپنی قانون سازی کی۔ اسی ذمہ داری کا اعتراف قمر رضا شہزاد اپنے غزلیہ مجموعے "پیاس بھرا مشکیزہ" میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

کہیں چراغوں کہیں ستاروں کو ٹانکنا ہے

پھر ان کی کرنوں سے ایک پیکر تراشنا ہے

دعا کے لہجے میں بات کرنی ہے ہر کسی سے

فقیر بن کر غرور لوگوں میں بانٹنا ہے

کہیں پہ دینا ہے بھیک میں تاج و تخت اپنا

کہیں کسی حسن کے لیے سوت کاتنا ہے

یہ لوگ شہر گلاب تک ہم سفر رہیں گے

تمام اگلا سفر مجھے خود ہی کاٹنا ہے(26)

چراغوں اور ستاروں کا ٹانکنا، کرنوں سے پیکر تراشنا، دعا کے لہجے میں بات کرنا، فقیر بن کر لوگوں میں غرور بانٹنا، بھیک میں تاج و تخت دنیا، حسن کے لیے سوت کاتنا اور اگلا سفر اکیلے کرنا شاعر کا انتخاب بھی ہے، ذمہ داری بھی ہے اور مجبوری بھی ہے۔ بہت سے کام انسان اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتا ہے اور بہت سی چیزیں اور کام خود اپنے لیے منتخب کرتا ہے لیکن بہت سارے کام کرنے پہ انسان کو مجبور کیا گیا ہے۔ انسان کو مجبور اور لاچار کرنے میں سماج اور معاشرت کے ساتھ ساتھ ایک بڑا ہاتھ کارپوریٹ سیکٹر کا ہے۔

انسان کی ضرورتوں میں اضافہ کر کے، کئی غیر ضروری اشیا کو ضروری بنا کے انسان کی زندگی میں مشکلات پیدا کر کے پھر انھیں آسان بنانے کے لیے اور مسائل کا حل دینے کے لیے انسان کو اپنا محتاج کر دیا جاتا ہے۔ کارپوریٹ سیکٹر کا طریقۂ واردات یہی ہے کہ انسان کو اپنا محتاج بنا کے اسے بے بس کر دیا جائے اور پھر اپنے مفاد کے لیے انسان کو مشین کا درجہ دے دیا جائے۔ پرانے زمانے میں جسموں کی جو غلامی تھی اب اس کی صورت بدل چکی ہے اب نئی طرز کی غلامی ہے۔ یہ وہ چمکتا جال ہے جس کی طرف انسان خوشی و سرشاری سے لپکتا ہے لیکن جلد وہ سنہری جال فولاد میں تبدیل ہو کے فرد کو جکڑ لیتا ہے اور رہائی کے لیے راہیں بند کر دیتا ہے۔ قمر رضا شہزاد کے کچھ مزید اشعار جو کارپوریٹ سیکٹر کے طریقۂ واردات کی عکاسی کر رہے ہیں:

ایک لمحہ وہ پذیرائی کرے گا اور میں
عمر بھر سایۂ احسان میں رہ جاؤں گا
بانجھ پیڑوں کو نہ کاٹے گا کوئی دستِ اجل
میں کہ پھل دار ہوں نقصان میں رہ جاؤں گا
آگ کے پھول تو بجھ جائیں گے لیکن شہزاد
میں سلگتا ہوا گل دان میں رہ جاؤں گا(27)

وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے تصور کے حوالے سے ہمارے اگلے معاصر غزل گو شعراء میں منتخب شاعر اختر عثمان ہیں۔ اختر عثمان انتہائے آزادی کی بات تو نہیں کرتے یا یوں کہیے جو آزادی، بے لگامی کی حدوں کو چھوئے وہاں تک اختر نہیں جاتے لیکن وجود کی بقا کے لیے جتنی آزادی درکار ہے۔ اختر اس کے خواہاں ہیں۔ وہ اپنے عہد پہ پوری نظر رکھتے ہیں۔ حالات و واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔ رویوں کو محسوس کرتے ہیں۔ باطن کی دنیا کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں اور اپنے عہد کی بندشوں کے خلاف گویا ہوتے ہیں۔ انھیں یہ دکھ ہے کہ ان کی زندگی سبزۂ بیگانہ بنی رہی اور وہ موجِ آزادی کے لیے ترستے رہے۔

جوں سبزۂ بیگانہ رہی زیست ہماری

تا عمر کسی پائے صبا موج کو ترسے(28)

اختر جانتے ہیں کہ خلش کے بغیر وہ شکستہ و پامال قریے تک کی ہوا بھی نہیں ملتی،انھیں دنیا کے جمال دوست نہ ہونے کا دکھ ہے۔انھیں شدت سے احساس ہے کہ آج ان جیسے انسان دوست لوگوں کی کوئی تمثال تک موجود نہیں، وہ صحرا میں کرگسوں کے غول اور انسانی وجود کے ڈھانچے دیکھتے ہیں اور سنبھل کے رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ان کے نزدیک عہدِ رفتگاں جدید عہد سے کہیں بہتر تھا کہ اس میں کچھ خلش، روش اور فن موجود تھا لیکن "جدید عہد میں تو پاتال تک نہیں ملتی":

خلش نہ ہو تو مہ و سال تک نہیں ملتی

ہوائے قریہ پامال تک نہیں ملتی

نکل چلو کہ یہ دنیا جمال دوست نہیں

یہاں تو داد خد و خال تک نہیں ملتی

کہاں وہ دور کہ ہم سے ہزار ہا تھے یہاں

کہاں یہ وقت کہ تمثال تک نہیں ملتی

یہ استخوان، یہ صحرا، یہ کرگسوں کے غول

ذرا سنبھل کے یہاں کھال تک نہیں ملتی

وہ رفتگاں کی روش، وہ خلش، وہ فن کی کشش

جدید عہد میں پاتال تک نہیں ملتی(29)

اختر عثمان کے ہاں کچھ ایسے عناصر موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انسان کی خود مختاری کے قائل ہیں۔وہ مذہبی رجحان ضرور رکھتے ہیں لیکن کبھی کبھی مذہبی فصیلوں کو پھلانگ کر دہر میں ارتعاش پیدا کرنے کی بات کرتے ہیں یہ وہ نکتہ ہے

جہاں سے سارتر کا انسان دوستی، انسان کی ذمہ داری اور احساس کا فلسفہ شروع ہوتا ہے کہ کسی خدا نے تمھارا بھلا نہیں کرنا ،اٹھو کمر کسو اور اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے دہر میں ارتعاش پیدا کرو۔ اختر عثمان اپنے وجود کو نکھارنے اور اپنی صلاحیتوں کو تراش کر دنیا میں اپنی بقا کو یقینی بنانے کی بات کرتے ہیں تاکہ بہتر بود و باش کر سکیں۔

اے مرے حرفِ خوش غنا، اب کہیں بود و باش کر

دیکھ تو کیا بنا دیا میں نے تجھے تراش کر

منتِ آسماں بھلا تابہ کجا اٹھایئے

توڑ فصیلِ بندگی، دہر میں ارتعاش کر(30)

جرمن فلاسفر کارل جیپسرز کہتا ہے:

"No choice without decision, no decision, without will, no will without duty, no duty without being"(31)

یعنی وجود ہے تو فرض ہے، فرض ہے تو ارادہ ہے، ارادے سے فیصلہ ہے اور فیصلہ ہے تو انتخاب ہے یہ سب ایک دوسرے کے بغیر کچھ نہیں ہیں۔ اب اختر عثمان کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ جہاں اختر اپنے وجود کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے اپنی دنیا آپ بنانے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ارادہ کرتے ہیں، فیصلہ کرتے ہیں، انتخاب کرتے ہیں اور پھر عمل کرتے ہیں۔ اپنی کوزہ گری سے جہان بناتے ہیں اور موج میں رہ کر بھنور بناتے ہیں۔

ترے جہان کی بنیاد میری کوزہ گری

نگار و نقشِ زماں چاک پر بناتا ہوں

نہیں قبول مجھے قرض کو تموج بھی

میں اپنی موج میں رہ کر بھنور بناتا ہوں

سبک ہوائیں مرے بادبان دیدہ و دل

میں ان کے رخ پہ ہی سمت سفر بناتا ہوں(32)

درج بالا شعراء کے اشعار، ان پہ جرح اور فلسفہ ءوجودیت پر کی گئی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاصر غزل گو شعراء کے ہاں فرد کی آزادی کا تصور بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ تصورِ آزادی کی وسعت کا محرک شعراء کا ذاتی مشاہدہ، ملکی و سماجی حالات اور مغربی علوم سے واقفیت ہے۔ وہ فرد کی آزادی کے قائل ہیں۔ انسان کی خود مختاری اور آزادیِ انتخاب پر یقین رکھتے ہیں۔

ب: فرد بحیثیت قانون ساز اور ماورائیت کا مرکز

انسان ابھی تک اپنی ابتدا و انتہا معلوم نہیں کر سکا مختلف عقائد اور نظریات تراش لینے کے بعد آج کا انسان اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ وہ خود ہی اس زمیں کا مرکز و محور ہے وہی قانون ساز اور ماورائیت کا مرکز ہے۔ اس نے ہی سب کچھ اپنے لیے کرنا ہے اب اس کا شعور ماضی سے بہت بلند ہو چکا ہے۔ اس نے پہلے مٹی کے بت تراش کر انھیں خدا کا درجہ دیا اور اپنے سب اختیارات اس کے سپرد کر دیے پھر وہ خدا کے تصور میں جدتیں لاتا گیا اور اب یہاں تک پہنچا کہ کچھ بھی ماورا نہیں ہے۔ کوئی خدا نہیں، اگر کچھ ماورا ہے تو وہ بھی انسان خود ہی ہے کہ سب کرشمہ سازی انسانی ذہن کی ہے۔ سارتر اپنی کتاب "وجودیت اور انسان دوستی" میں انسان کو ماورائیت کا مرکز قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

> "انسان ہمیشہ اپنی ذات سے باہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے سے باہر خود کو ظاہر کرنے اور گم کرنے ہی سے خود کو وجود دیتا ہے اور دوسری طرف اعلیٰ مقاصد کی جستجو میں خود کو وجود رکھنے کے قابل بناتا ہے۔ انسان چونکہ اس طرح اپنے آپ سے بلند ہو رہا ہے اور صرف اس عمل کے حوالے سے اشیا کو گرفت میں لا سکتا ہے، اس لیے وہ خود ہی اپنی ماورائیت کا مرکز ہے"(33)

شعورِ ذات ہی ماورائیت کی علامت ہے اور جب انسان خود سے بلند ہونے لگتا ہے تو ماورائیت کا مرکز بن جاتا ہے اور پھر قانون ساز کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اپنی اخلاقیات آپ طے کرتا ہے، اعلیٰ مقاصد کی جستجو پیدا کرتا ہے، ذاتی خوشی اور

دل چسپی کو اہمیت دیتا ہے اور وجود کی ضرورت اور اہمیت کی درجہ بندی کرتا ہے۔ اپنی آزادی اور اپنے حقوق کا تعین کرتا ہے۔

جب صنعتی معاشرے اشیا کی ضرورت کو انسان پر ترجیح دینے لگتے ہیں تو وہ تنہائی اور بیگانگی کا شکار ہونے لگتا ہے پھر وہ ان تمام عناصر کے خلاف فکری بغاوت کا علم بلند کرتا ہے جو فرد کی آزادی کو سلب کر رہے ہوں۔ کارپوریٹ سیکٹر کے مشینی عمل نے کیٹالسٹ کا کام کیا اور وجودیوں کی فکر کو نئے زاویوں سے تعمیر کیا۔ اس طرح انسان نے اپنے فیصلے خود کرنے کی ٹھانی، مرکزیت حاصل کی اور قانون ساز بنا تاکہ ایسے ضابطے طے کیے جائیں جن سے انسانی وجود اور اس کی آزادی کی حفاظت ممکن ہو۔

معاصر غزل گو شعراء میں میر احمد نوید انسان کی مرکزیت کے قائل ہیں ان کے نزدیک ساری فسوں کاری انسان کی اپنی ہے۔ انسان کے خوف اور لالچ نے اپنے لیے آپ خدا تراشے نہ کہ خدا نے انسان بنائے۔ یہ خدا، رحمان، شیطان انسان ہی کے دم سے ہیں۔ انسان ہی مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور یہی امکان کا پتلا ہے۔

خدا ہوتا نہ ہوتا ہاں اگر انساں نہیں ہوتا

کوئی رحماں نہیں ہوتا کوئی شیطاں نہیں ہوتا

تراشے ہیں خدا اس خوفِ نامعلوم نے کتنے

یہ بت امکاں کا پتلا ہے، اگر امکاں نہیں ہوتا؟(34)

میر احمد نوید کا تعلق وجودیت کے دبستانِ الحاد سے ہے وہ سارتر کے پیروکار ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے تو وہ انسان ہی ہے۔

مجاز و وہم و حقیقت، گمان و شک و یقیں

خبر کی راہ میں ہیں کس قدر سراب نہ پوچھ

جو کہہ رہا ہوں میں انسان ہے خدا کا وجود

ہے اس گناہ کا کتنا بڑا ثواب نہ پوچھ (35)

مغربی معاشروں نے تو پہلے ہی خدا کو مار دیا تھا۔اب ہمارے ہاں بھی انسان خدا کی جگہ لے رہا ہے اور خود مختاری کا اعلان کر رہا ہے جیسا کہ اوپر میر احمد نوید نے کہا ہے۔

مذہبی ہونے کے باوجود بعض اوقات شاعر کے تخیل کی پرواز سے مذہبی مدار اسے باہر لے جاتی ہے جہاں وہ فصیلِ بندگی کو توڑ دیتا ہے اور تشکیک سے گزرتا ہوا انکار تک جا پہنچتا ہے۔ بعض بنیاد پرست بھی بسا اوقات حالات کی سنگینی اور بے بسی کے سبب باغیانہ رویہ اپنا لیتے ہیں۔ ہمارے معاصر غزل گو شعراء کی زیادہ تر تعداد اسی نوعیت کی ہے۔ وہ باقاعدہ کسی ایسی تحریک کا حصہ تو نہیں ہوتے لیکن ان کے ذہنی میلانات تشکیک اور دہریت کی جانب ہوتے ہیں جہاں وہ خدا کو انسان سے بدل دیتے ہیں اور انسان کو مرکزیت عطا کرتے ہیں اور قانون ساز بناتے ہیں۔ میر احمد نوید کا شمار ایسے شعراء میں کیا جا سکتا ہے جو خود سے بلند ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

تو اس گمان سے کب اپنی جاں چھڑائے گا

کسی نے پیدا کیا کوئی بخشوائے گا

خدا نہیں ہے کہ ہے سب یہی سنا رہے ہیں

وہ کون ہے کہ جو انسان کی سنائے گا

تو جب تلک نہیں نکلے گا خوف و لالچ سے

خود آپ اپنا خدا ہونا کیسے پائے گا (36)

میر احمد نوید اپنے شعری مجموعے "وجود" میں خود کو مرکز و محور قرار دیتے ہیں اور انھیں انسان کے محور ہونے پہ اعتراض ہے۔انھیں علمِ گردشِ سیارگاں سے بے خبر جانتے ہیں۔

کیااس کو علمِ گردشِ سیارگاں نہیں

یہ کون کہہ رہاہے کہ محور نہیں ہوں میں(37)

اور پھر کہتے ہیں:

مری ہی ذات ہے مرکز تمام سمتوں کا

یہ شرق و غرب و جنوب و شمال کیا شے ہے(38)

"وجود" کی یہ مسلسل غزل بھی انسان کی مرکزیت، حاکمیت، قانون سازیت اور ہنگامہ خیزیت کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں میر احمد نوید خود کو راز حقیقت قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک انسان جواز بھی اور بے جواز بھی ہے، درونِ ساز بھی وہی کار فرماہے اور برونِ ساز بھی، نیاز مند بھی انسان ہے اور بے نیاز بھی، آئنہ طراز بھی، درعطا بھی ہے۔ کاسہ دراز بھی عدمیت ہو کے وجودیتِ انسان ہی دنیا کی گہما گہمی اور ہنگامہ خیزی کا ذمہ دار ہے۔ جب انسان ہی سے رونقِ ہستی ہے تو پھر وہی مجاز ہے دنیا کے قوانین بنانے کا اور اپنی حدود کے تعین کرنے کا۔

مجھی سے رازِ حقیقت مجازِ راز بھی میں

جواز بھی سبھی مجھ سے ہیں بے جواز بھی میں

مجھی سے ہے یہ خموشی مجھی سے ہے یہ سخن

درونِ ساز بھی میں اور برونِ ساز بھی میں

مجھی سے عشق کی خلوت مجھی سے جلوتِ حسن

نیاز بھی سبھی مجھ سے ہیں بے نیاز بھی میں

مجھی سے چشم کی حیرت مجھی سے تابِ طلسم

کہ آئنہ بھی ہوں میں آئنہ طراز بھی میں

مجھی سے سارے جواب اور مجھی سے سارے سوال

درِ عطا بھی ہوں میں کاسہِ دراز بھی میں (39)

صابر ظفر کے ہاں یوں تو غالب عنصر مزاحمت کا موجود ہے لیکن ان کے کلام میں وجودیت کے دیگر عناصر بھی وافر مقدار میں ملتے ہیں خاص کر فرد کی آزادی، سوچ اور انتخاب کی آزادی اور فرد کی مرکزیت اور قانون سازی۔ قانون سازی سے مراد یہ ہے کہ انسان وجودی تقاضوں کے تحت کچھ ضابطے طے کرے تاکہ وجود کو نقصان نہ پہنچایا جا سکے اور اس کی نگہداشت ہو سکے۔ تاکہ فرد آزادی سے فیصلے کرے اور اپنے لیے معیارات طے کرے۔

دوستوں کے لیے رکھتا ہوں محبت کی زباں

دشمنوں کے لیے آوازِ عدم رکھتا ہوں

روکنے والا نہیں جنسی درندوں کو کوئی

پوچھ مت، روح میں کیا رنج والم رکھتا ہوں (40)

پہلے شعر میں صابر ظفر نے دوستوں اور دشمنوں میں تفریق کی اور دونوں کے لیے ان کے کردار کے مطابق معیار بنایا اور ضابطہ طے کیا کہ دونوں کس رویے کے مستحق ہیں۔ ظاہر ہے دوست دل کے قریب ہیں تو ان کے لیے محبت کی زبان کا انتخاب ہو گا اور دشمنوں سے انھی کے لہجے میں بات ہو گی۔ دوسرے شعر میں شاعر یہ سمجھتا ہے کہ جنسی درندوں کو ایسے عمل سے روکا جائے جو کسی نہ کسی سطح پر وجود کو نقصان پہنچا رہا ہو چونکہ شاعر ایسا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا اس لیے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

رشتوں کے لیے معیار بنانا اور درندوں کو سزا دینا اور قوانین بنانا فرد ہی کی ذمہ داری ہے اسی نے اپنی اخلاقیات اور قوانین وضع کرنے ہیں۔ کیوں کہ وہی قانون ساز ہے اور مرکزیت کا حامل ہے۔ زمیں زاد جب سر اٹھائیں گے تو آسماں کو جھکنا ہی پڑے گا۔

ظفر اہلِ زمیں جب سر اٹھائیں گے

جھکیں گے آسماں آہستہ آہستہ (41)

صابر ظفر کے نزدیک ماورا سے پرے کوئی نہیں ہے اگر ہے تو سویا ہوا ہے اسے اہلِ زمیں سے کوئی غرض نہیں اگر ہوتی تو ہماری آہ و بکا پہ کان دھرتا مسیحائی کرتا۔ امورِ جہاں میں دل چسپی لیتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہے اگر ماورا کچھ نہیں ہے۔ تو پھر انسان خود ہی ہے جس نے ماورائیت تشکیل دی ہے وہی ان فتنہ سامانیوں کا سبب ہے زیرِ ناتواں ہے اور خاک پر طاقت ور ہے۔

کوئی جاگا نہ ماورا سے پرے

نالہ کر دیکھا، گریہ کر دیکھا

ناتوانی کو دیکھا زیرِ زمیں

اور طاقت کو خاک پر دیکھا(42)

صابر ظفر اپنے شعری مجموعے "روح قدیم کی قسم" میں اسی خیال کو دہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں انھیں اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا وہ خود ہی اجتہادی ہیں آسمان ان کی منزل نہیں جب آسماں منزل نہیں تو پر کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں زمیں پہ رہ کے زمیں زادوں کے لیے ضابطے طے کرو۔

ہوتا کوئی آسماں جو منزل

پر کھولتے ابر و باد میں ہم

کچھ اپنے سوا نظر نہ آیا

بے خود ہوئے اجتہاد میں ہم(43)

معاصر غزل گو شاعر قمر رضا شہزاد خود کو ظلِ الٰہی کہتے ہیں اور اپنی ہی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں نہ صرف اپنے فیصلے آپ کریں گے بلکہ باقیوں کے لیے بھی وہی قواعد تشکیل دیں گے وہ خود فیصلہ کریں گے کہ لباسِ زر میں رہنا ہے یا حالتِ غربت میں یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ انسان ہی دنیا کا کرتا دھرتا ہے اگر کوئی الٰہی ہے بھی تو ظلِ الٰہی انسان ہے اور یہ زمین کی بادشاہی اس کی ہے۔

لباسِ زر کہ غربت میں رہوں گا

میں اپنی اصل حالت میں رہوں گا

میں اپنا آپ ہوں ظلِ الٰہی

میں اپنی ہی حکومت میں رہوں گا(44)

نازبٹ کے بقول:

"قمر رضا شہزاد جس اعتماد سے کائنات کو اپنے روبرو کرتے ہیں اور اس پر اپنے نقد و نظر کے تیر برساتے ہیں۔ بلا کے حساس مشاہدہ کار بن جاتے ہیں اور ان کے مصاریع اور تلازموں میں ریاضت ہی ریاضت ہے تبھی تو ان کے اشعار کے تیر دل پر چوٹ کرتے ہیں۔ نظر کو جذب کرتے ہیں اور پھر دل کو بارِ دگر تعمیر کی دعوت دیتے ہیں۔"(45)

طالبِ منصب و جاہ ہو یا گمراہی، کسی کی حمایت ہو کہ مخالفت فرد ہی اپنے لیے قانون ساز اور اخلاقی معیارات بنانے والا ہے اپنے وجود اور اپنے باطن کی اہمیت و ضرورت کے تحت وہی فیصلہ ساز ہے۔ قمر رضا شہزاد کے اشعار دیکھیے:

طالبِ منصب و جاہ بھی ہو سکتا ہوں میں

کبھی کبھی گمراہ بھی ہو سکتا ہوں میں

دے سکتا ہوں اصل بیان کٹہرے میں

ترے خلاف گواہ بھی ہو سکتا ہوں میں(46)

سارتر کہتا ہے کہ انسان کو زمیں پر پھینکا گیا ہے اب اسے اپنا بوجھ آپ اٹھانا ہے(وجودیت اور انسان دوستی، ص ۲۳)اسی تناظر میں قمر رضا شہزاد بھی پریشان ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ آخر ہم نے یہ بوجھ خود پہ کیوں سوار کیا ہے؟ کیوں تھکی ہوئی زمیں کو بوجھ اٹھائے چل رہے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں ہے فرد کو اپنے جیسے دوسرے افراد کے غم و آلام میں بھی شراکت دار بننا پڑتا ہے یہ بھی دوہری اذیت ہے۔ بات واضح ہے اور سوال پریشان کن ہے۔ ہم زمیں پہ ہیں اور اپنا بوجھ ڈھونا ہے یہ طے شدہ بات ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم یہاں کیوں آ گئے؟ کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہیں؟ جب تک عقل ان سوالوں

کا جواب نہیں ڈھونڈ لیتی تب تک ہمیں نے طے کرنا ہے کہ ہم نے زمیں پر کیسے رہنا ہے کیوں کہ معلوم جہان ابھی تک انسان ہی دنیا کا مرکز و محور ہے اور یہاں غیر محفوظ بھی۔ بقول قمر رضا شہزاد:

یہ بات ہم بھی جانتے نہیں کہ ہم نے کیوں

کسی کے دکھ کو اپنا دکھ شمار کر لیا

تھکی ہوئی زمین سر پہ رکھ کے چل دیے

یہ بوجھ ہم نے خود پہ کیوں سوار کر لیا(47)

قمر رضا شہزاد فرد کو مرکزیت و محوریت عطا کرتے ہیں ان کے نزدیک انسان ہی صاحبِ اختیار ہے اور محتاج بھی ہے۔ یہ کون و مکاں انسان کے آگے کیا وقعت رکھتے ہیں۔ انھیں تو ایک جست میں پار کیا جا سکتا ہے اور دیوانہ وار رقص سے کون و مکاں کو لرزایا جا سکتا ہے۔

مرے لیے تیرے کون و مکان کیا شے ہیں

میں ایک جست میں ان سب کے پار ہوتا ہوں

مری دھمک سے زمان و مکاں لرزتے ہیں

میں ایک رقص ہوں دیوانہ وار ہوتا ہوں(48)

قمر رضا شہزاد اپنے شعری مجموعے "بارگاہ" میں اس خیال کو دہراتے ہیں اور انسان کے ٹوٹنے بننے کے عمل کو بیان کرتے ہیں۔ وجود اپنی ضرورتوں کو خود پورا کرتا ہے وہ گرنے اور پھر سنبھلنے کا فن جانتا ہے اور پھر اسی انسانی وجود کی وسعتیں اور رفعتیں ہیں کہ خدا اس سے ملنے اسے حجرے میں آتا ہے۔ الحادی وجودیوں کے نزدیک خدا نے انسان کو نہیں بلکہ انسان نے خدا کو بنایا ہے۔ قمر رضا شہزاد کے درج ذیل اشعار انسان کی مرکزیت اور قانون سازی کی عمدہ مثال ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ماورا میں کچھ نہیں ہے۔ اگر ہے تو انسان کا بنایا ہوا ہے گویا انسان ہی اپنی ذات سے بلند ہو کے ماورائیت کا مرکز بن گیا ہے۔

زمیں پہ گر کے سنبھلنے کا فن بھی آتا تھا

میں روز ٹوٹ بھی جاتا تھا بن بھی جاتا تھا

عجیب رونقیں رہتی تھیں میرے حجرے میں

کبھی خدا بھی میرے پاس آتا جاتا تھا(49)

معاصر غزل گو شاعر اختر عثمان فرد کی رفعت اور مرکزیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک انسان انتہائے عرفاں اور حدِ امکاں تک جاتا ہے۔ اس کی نظر میں اور شش جہات بھی ہیں وہ اس دنیا کی تسخیر کے بعد اور دنیاؤں پہ نظر جمائے ہوئے ہے اور یہ فرد کا جنوں اسی وسعتِ بیاباں تک نہیں ہے۔ انسان کے وجود میں موج در موج کئی بھنور مخفی ہیں۔ جو طوفان برپا کرتے ہیں۔

پڑاؤ کرنا نہیں انتہائے عرفاں تک

گرفتِ خواب میں جانا ہے حدِ امکاں تک

مری نگاہ میں کچھ اور شش جہاں بھی ہیں

جنوں نہیں ہے فقط وسعتِ بیاباں تک

مرے وجود میں مخفی ہیں موج موج بھنور

مجھے تموجِ مژگاں سے دیکھ طوفاں تک(50)

فرد کے ماورائیت کے مرکز کے ذیل میں اختر عثمان کا یہ شعر خاص اہمیت کا حامل ہے۔

مٹی بھی میسر تھی ہمیں چاک بھی اختر

اس پر بھی تمنائی تھے آوازہِ کن کے(51)

روئے زمین پر انسانی وجود کے لیے تمام تر وسائل موجود ہیں۔ انسان نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے وجود کی ضرورت کے تحت دنیا کو ترتیب دینا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ انسانی وجود کہاں سے آیا اور دنیا میں موجود باقی عناصر

کہاں سے آئے انسان نے موجود وسائل سے بنی بنائی دنیا اپنے ذوق اور ضرورت کے تحت از سرِ نو ترتیب دینی ہے۔ اسے مٹی بھی میسر ہے اور چاک بھی تمام وسائل موجود ہیں اور اسے کے لیے ہیں جہاں جو بنانا ہے اسی نے بنانا ہے پہلے مصرعے میں موضوع کو پوری طرح گرفت میں لانے کے بعد اختر عثمان دوسرے مصرعے میں انسانی فطرت اور وجودی کمزوریوں کا ذکر کرتے ہیں کہ مٹی اور چاک کی موجودگی کے باوجود انسان کس صدائے کن کا منتظر بیٹھا ہے حالاں کہ ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی۔ اپنے شعری مجموعے "ابدتاب" میں اختر عثمان کہتے ہیں یہ سب غیاب و شہود مجھی سے بندھے ہوتے ہیں۔

بندھا ہوا ہے مجھی سے یہ سب غیاب و شہود

میں جب تک اس میں ہوں، ہے، یہ سلسلہ یوں ہے(52)

سارتر کے مطابق فرد کا خود سے بلند ہونا بس ماورائیت ہے۔ اختر عثمان فرد کو وہی بلندی عطا کرتے ہیں جہاں وہ کن کہے اور کر کے دکھادے یہی اس کی انفرادیت ہے اور فن کاری ہے۔ جینے کے لیے جی کی جوالا کو جل میں پھینکنا پڑتا ہے اور بلند ہونے کے لیے کن کہنے کا ہنر سیکھنا پڑتا ہے۔ یہی عوامل فرد کو قانون ساز اور ماورائیت کا مرکز بناتے ہیں۔

جینا ہے تو جی کی جوالا جل میں پھینکو

بھیتر بہنے سے یہ سب تھوڑی ہوتا ہے

کن کہنا اور کر کے دکھانا ہے فن کاری

سب کے کہنے سے یہ سب تھوڑی ہوتا ہے(53)

درج بالا اشعار اور فکر مباحث کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی، خود مختاری اور اس کے قانون ساز اور ماورائیت کا مرکز ہونے کے حوالے سے خاصا مواد موجود ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو غزل میں مغربی تحریکوں کے اثرات سرائیت کیے ہوئے ہیں۔ خاص کر ماورائیت کے مرکز کے حوالے سے ہمارے شعراء کافی حد تک واضح ہوتے جا رہے ہیں اور مذہبی نقطہ نظر رکھنے کے باوجود بھی کہیں کہیں دائروں سے باہر نکل کر فرد کو خدا کی جگہ بٹھاتے اور فیصلے کرواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ج: انفرادیت اور اجتماعیت کا امتزاج

کارپوریٹ سیکٹر کے مشینی عمل نے انسان کو مغائرت اور بیگانگی کا شکار کر دیا ہے۔اسے تنہائی اور خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کلچر میں قباحت یہ ہے کہ امیر ،امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ملک پر غیر ملکی قرضے چڑھتے ہیں۔شرحِ سود میں اضافہ ہوتا ہے تو کمزور طبقہ مزید کمزور ہو جاتا ہے۔اسے مستقبل اور حال کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اسے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے تاکہ آنے والے خوف سے نپٹا جا سکے۔ مسلسل کام اس کے وجود کے لیے ظاہری اور باطنی ہر دو طرح سے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔جسمانی امراض کے علاوہ ذہنی تناؤ، تنہائی اور خوف کا احساس غالب ہو جاتا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ اس سے انسان دو طبقوں میں تقسیم ہو کے رہ جاتا ہے۔ایک طرف تو پینے کے لیے پانی تک نہیں ملتا اور دوسری جانب عالی شان محلّات میں اعلیٰ درجے کی شراب کے دور چل رہے ہوتے ہیں۔مزدوروں کی کمائی کا بڑا حصہ مالکان ہتھیا لیتے ہیں۔کام سولہ گھنٹے اور قیمت چار، چھے گھنٹوں کی ادا کی جاتی ہے۔بس اتنی رقم ملتی ہے کہ بہ مشکل زندہ رہا جائے اور مالکان کے مفاد کے لیے خود بھٹی کا ایندھن بنا رہے۔ مصنوعی طلب پیدا کر کے رسد بڑھائی جاتی ہے اور پھر بڑی ہی چالاکی سے اپنے ملازمین کی رقم کارپوریٹ سیکٹر واپس لوٹ لیتا ہے۔اس دہرے معیار نے وجودی مفکرین کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں امتزاج پیدا کر کے انسانی وجود کو بہتر بنا سکیں۔

وجودیت انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعیت پر زور دیتی ہے ۔انفرادیت اور اجتماعیت میں امتزاج پیدا کرنے کی خواہاں ہے یہی وجہ ہے کہ سارتر وجودیت کو انسان دوستی قرار دیتا ہے اور فردِ واحد کی آزادی کو جمہور کی آزادی سے منسلک کرتا ہے۔اس کے نزدیک ایک کی آزادی کا انحصار دوسروں پر بھی ہے۔سارتر "وجودیت اور انسان دوستی" میں لکھتا ہے:

> "آزادی کا ارادہ کرتے ہوئے ہم دریافت کرتے ہیں کہ اس کا انحصار مکمل طور پر دوسروں کی آزادی پر ہے اور یہ کہ دوسروں کی آزادی خود ہماری آزادی پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک انسان کی تعریف کے طور پر آزادی دوسروں پر منحصر نہیں بلکہ جونہی کوئی کمٹمنٹ کی جائے تو اس وقت مجھے دوسروں کی آزادی کا ارادہ اپنی آزادی کے ساتھ کرنا ہوگا۔اس وقت تک میں آزادی کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا جب تک دوسروں کی آزادی کو بھی اپنا مقصد نہ بناؤں "(54)

شاہین مفتی فرانسیسی دانش ور اور ادیبہ سیمون ڈی بوار کے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"سیمون کاخیال ہے کہ ایک فرد کی آزادی کاتصور دوسرے لوگوں کی موجودگی سے بندھا ہے۔ ہر حال میں کچھ تکلیف دہ مسائل باقی رہ جاتے ہیں اگر کوئی فردِ واحد اخلاقی اقدار کی انتہا پر ہے تو اس سے دوسروں کو کیافرق پڑتاہے؟"(55)

ان مباحث سے پتا چلتاہے کہ فرد کی آزادی کے باب میں انفرادیت اور اجتماعیت کا امتزاج بہت ضروری ہے اپنے فیصلے کرتے ہوئے دوسروں کے مفادات، مشکلات اور حاصلات کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ محض اپنے فائدے کے لیے دوسرے کانقصان کرناوجود کے ساتھ ناانصافی ہے۔ معاصر غزل گو شاعر میر احمد نوید انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج سے خوب واقف ہیں وہ انفرادیت بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اجتماعیت کو بھی ترجیح دیتے ہیں۔ وہ خدائے ہست کو مخاطب کر کے پوچھتے ہیں کہ اپنی فکر زیادہ اہم ہے یا جہاں والوں کی؟

خدائے ہست مقدم رکھوں کہاں کی فکر

میں اپنی فکر کروں یا کروں جہاں کی فکر(56)

انسان ہی انسان کے درد کادرمان کرتاہے نہ کہ اضافہ ،اجتماعیت کاخیال رکھنے سے ہی انفرادیت کی نمو ہوگی یوں مالک وخادم بن کے بات نہ بنے گی۔ مختار بن کے دوسرے کو محتاج کرنے کی بجائے دوسرے کو بھی صاحبِ اختیار کرنااور ان کے زخموں میں اضافہ کرنے کی بجائے زخموں پہ مرہم لگاناہی میر احمد نوید کا مسئلہ ہے وہ چاہتے ہیں کہ تیر و تبر دکھانے کی بجائے ایک دوسرے کے ناز اٹھائے جائیں کہ انسان اسی لائق ہیں۔

نہ کہ یہ تیر و تبر مجھ پہ چلائے جاتے

میں تو وہ ہوں کہ مرے ناز اٹھائے جاتے

ایک اک کر کے وہ ہر زخم پہ رکھتا مرہم

ایک اک کر کے اسے زخم دکھائے جاتے(57)

وجودیوں کا کہنا ہے کہ انسان کوانسان بن کے رہنا ہے نہ کہ مشینوں میں بدلنا ہے۔انسان کواحساسِ تنہائی اور خوف میں مبتلا نہیں کرنا بلکہ اس کے وجود کے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہے انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اجتماعیت کا شعور بیدار کرنا ہے۔خدااور خدا کے مباحث کو ترک کر کے انسان کوانسان سے رجوع کرنا ہے۔بقول میر احمد نوید:

کردی ہے ختم میں نے ہر اک سے خدا کی بحث

انسان وآدمی کی طرف آرہاہوں میں(58)

میر احمد نوید اپنے شعری مجموعے "ہاں اور نہیں کے درمیاں" میں تنہائی و کرب کا شکار، بیگانگی اور عدمیت وشئیت میں مبتلا، زندگی سے بیزار فرد کو جستجو اور تلاش کرنے والے فرد کو اجتماعیت کی دعوت دیتے ہیں۔انھیں بتاتے ہیں کہ تمھارے درد کا درماں جہاں کے سفیروں اور دل کے امیروں نے کرنا ہے۔اسے لیے مجلسی زندگی اپناؤاور ایک دوسرے کے مسائل کا حل ڈھونڈو۔اسی میں مسیحائی کا راز پوشیدہ ہے۔آسمان سے منسوب کتابوں کے پیچھے چھپ کے بیٹھنے سے تمھیں مطلوب خبریں نہیں ملنی خبر کے لیے خبیروں میں آنا پڑے گا۔

چھپ مت پسِ کتاب فقیروں میں آکے بیٹھ

درکار ہے خبر تو خبیروں میں آکے بیٹھ

دل بھر گیا ہے تیرا جو کہنہ جہان سے

اک پل نئے جہاں کے سفیروں میں آکے بیٹھ

ملوائیں گے یہی تو تجھے تیری اصل سے

آزادی چاہیے تو اسیروں میں آکے بیٹھ(59)

میر احمد نوید کے شعری مجموعے "وجود" میں موجود درج ذیل مسلسل غزل وجودیت کے مختلف پہلوؤں کا بڑی عمدگی سے احاطہ کرتی ہے۔اس میں وجودیت کے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے جن میں انسان اضطراب و تشکیک کا شکار ہوتا ہے۔اپنے ہی اندر الجھا رہتا ہے۔مختلف سوال اٹھاتا ہے اور ان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس غزل میں مرکز و مدار کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔شاعر کو سمجھ نہیں آرہی کہ وہ مرکز و محور ہے کہ مدار ہے۔وہ اس گردش اور فرار کی

کیفیت میں الجھا ہوا ہے۔ غزل کی پوری فضا ہی الجھاؤ کا شکار ہے۔ شاعر اس وہم وحصار میں مبتلا ہے کہ کائنات فرد کے گرد ہے یا فرد کائنات کے گرد ہے؟ نمودِ خاک اور جوہر کی نمو کا مسئلہ در پیش ہے انھی مسائل میں ایک مسئلہ انفرادیت اور اجتماعیت کا بھی زیرِ غور ہے متذبذب کیفیت ہے شاعر سمجھنا چاہتا ہے کہ وہ تنہا ہے یا قطار میں ہے آگے چل کے جبر واختیار کا مسئلہ در پیش ہے اور آخر میں شاعر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ اب تک اپنے ہی انتظار میں ہے گویا وجودیت کے کئی پہلو اور کئی زاویے ایک ہی غزل میں در آئے ہیں:

مرکز ہوں یا مدار میں الجھا ہوا ہوں میں

گردش ہوں یا فرار میں الجھا ہوا ہوں میں

ہے کائنات گرد مرے یا میں اس کے گرد

اے وہم کس حصار میں الجھا ہوا ہوں میں

جوہر ہے کس نمو میں مرا اے نمودِ خاک

ہوں نور یا کہ نار میں الجھا ہوا ہوں میں

تنہا بھی ہو قطار میں بھی ہوں تو اے نگاہ

تنہا ہوں یا قطار میں الجھا ہوا ہوں میں

فطرت کے بے تکلفِ ناز و نیاز سے

ہاں جبر واختیار میں الجھا ہوا ہوں میں

اپنی صدا پہ کان لگائے ہوئے ہوں روز وشب

اپنے ہی انتظار میں الجھا ہوا ہوں میں (60)

معاصر غزل گو شاعر صابر ظفر کے ہاں بھی وجودیت کے تناظر میں انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج کا شعور ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ فرد کی آزادی اور جبر کے خلاف مزاحمت کے علم بردار ہیں۔ فرد کی انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج

کے قائل ہیں۔ وہ جہاں اپنا رنگ دوسروں پر چڑھانا چاہتے ہیں وہیں دوسروں کے رنگ میں رنگنا بھی چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی طرح آزاد معاشرے پروان چڑھ سکتے ہیں۔اپنے شعری مجموعے "آواز کی لہر پر چلا میں" میں لکھتے ہیں:

کچھ رنگ بدل دیے تھے میں نے

کچھ رنگ مجھے بدل رہے تھے(61)

وجودیوں کو اصل مسئلہ وہاں درپیش آتا ہے جہاں فرد افراد کے حاکم بن جاتے ہیں اور ایک وجود اپنی بقا کے لیے دیگر انسانی وجودوں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ انفرادیت کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں اجتماعیت کا نقصان کیا جاتا ہے۔ حرص و ہوس کی اور شہنشاہیت کی خو انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے حاکم محکوم یا ظالم مظلوم۔ یہ حاکمیت تختِ شہی پر آکر بھی ہو سکتی ہے یا اپنی آپ کو عسکری یا معاشی طور پر مضبوط کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں آمریت ہو یا کارپوریٹ سیکٹر دونوں ہی اجتماعی طور پر انسانی وجود کے لیے نقصان دہ ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں آمریت نے اور پھر کارپوریشن سیکٹرز نے ہمارے ہاں بہت زیادہ خوف و ہراس پھیلایا ہے۔ جسمانی اور باطنی سطح پر انسانی وجود کا نقصان کیا ہے۔ صابر ظفر نے ایسے اداروں کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی اور باقی انسانوں کو بھی انسان سمجھنے کا کہا۔ان کے درج ذیل شعر ایسی صورت حال کا نوحہ ہیں:

زندگی اب کہاں رہی موت قبول کیجیے

زندہ وجود دیجیے،لاش وصول کیجیے

جو ہیں بنے ہوئے خدا،ان کو ہے میرا مشورہ

ایک تو ہاتھ کٹ گیا،اور نہ بھول کیجیے(62)

بقول طارق ہاشمی:

"صابر ظفر نے بعض بے جان اشیا یا اوزاروں کو زبان دے کر علامتی پیرائے میں مزدوروں اور کسانوں کے طبقۂ محروم کے دکھوں کو بیان کیا ہے۔ جس طرح مجید امجد نے اپنی ایک نظم "ہڑپہ کا کتبہ" میں ہل چلانے والا بھی اسی طرح مجبور محض ہے۔ جیسے کہ وہ بے زبان حیوان۔اسی طرح صابر ظفر نے بھی محنت کشوں کو ان

کے زرعی اوزاروں کی مثال قرار دیا ہے کہ وہ بھی محض محنت کے عمل کا حصہ ہیں لیکن جو فصل یا پھل حاصل ہوتا ہے اس میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔"(63)

کارپوریٹ سیکٹر نے طبقاتی تقسیم کرتے ہوئے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے صابر ظفر نے اپنی کتاب "روحِ قدیم کی قسم" میں اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ فرد نے فرد کے حق پہ جو ڈاکا ڈالا ہے اور جس نئے طریقۂ واردات سے انسانوں کو متاثر کیا ہے صابر ظفر نے ایک ہی شعر میں موضوع کا مکمل احاطہ کر دیا ہے۔

میرا بھی یہ چمن ہے مگر باغبان نے

جو پیڑ میرے نام کیا بے ثمر کیا(64)

معاصر غزل گو شاعر قمر رضا شہزاد کے ہاں بھی انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج کے حوالے سے وافر کلام موجود ہے۔ اپنے تازہ شعری مجموعے "بارگاہ" میں کہتے ہیں:

یہی نہیں کہ مجھے دوسروں کی فکر نہ تھی

میں اپنے شر سے کبھی خود کو بھی بچاتا تھا(65)

ایک انسان کو جہاں دوسرے انسان سے خطرہ ہے وہیں انسان کو اپنے آپ سے بھی خطرہ ہے باطنی دنیا میں طلاطم خیز موجیں انسان کے اندر بھی ایک شر پھیلا کے رکھتی ہیں۔ شاعر کے مطابق میں پہلے اپنے باطن کی شورانگیزیوں سے خود کو بچالوں پھر دوسروں کی مدد بھی کروں گا کیوں کہ مجھے بھی ان کی فکر لاحق ہے۔ اسی طرح وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ میں ان مصائب کا مارا اور مزاحمت کی آواز بنا اکیلا شخص نہیں ہوں بلکہ میرے پیچھے میرے جیسے بے شمار لوگ ہیں۔ ایک میں تمھارے ستم کا شکار نہیں بلکہ یہ اجتماعی مسئلہ ہے اور پھر کہتے ہیں یہ لوگ اس کائنات سے تنگ ہیں۔ اب کہیں اور بستی بسانی چاہیے ان خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ فرد کا انفرادی مسئلہ بھی اکثر اوقات اجتماعی مسئلہ بن جاتا ہے۔

مرے عقب میں بہت سے ہیں میرے جیسے لوگ

کسے کسے مری رہ سے ہٹاؤ گے صاحب

یہ لوگ تنگ ہیں اس کائنات سے شہزاد

اب اور کون سے بستی بساؤ گے صاحب(66)

شازیہ رباب کے بقول:

"وہ انسان تو موجودہ زمانے کے ہیں مگر ان کا وجدان انھیں کئی زمانوں میں لیے پھرتا ہے۔ کبھی وہ گزرے زمانوں کی گرد میں اٹے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں آنے والے زمانوں کو چیلنج کر کے ان کے لیے کمر بستہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں ہر روز کچھ نیا اور منفرد کرنے کی امنگ نظر آتی ہے۔ یہ نیا اور منفرد کرنے کی امنگ بعض اوقات انھیں زمین کی تہوں میں جھانکنے پر مجبور کرتی ہے تو بعض اوقات وہ خلاؤں کو پھلانگتے ہوئے اور آسمانوں اور وہاں مکینوں سے محو گفتگو نظر آتے ہیں۔"(67)

قمر رضا شہزاد اپنے ساتھ دوسروں کا بھلا بھی کرنا چاہتے ہیں کہ یہی اجتماعیت کا حسن ہے اور ساتھ میں انھیں اپنی انفرادیت کی فکر بھی کھائے جا رہی ہے اور وہ اپنا پتہ بھی کرنا چاہتے ہیں ان کے درج ذیل اشعار انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج کا خوب صورت اظہار ہیں۔

یہ کائنات توڑ کر اس کو نیا کروں

میں خلقتِ خدا کا کوئی تو بھلا کروں

آخر کبھی تو میری بھی مجھ پر نظر پڑے

میں کس جگہ ہوں ایک دن اپنا پتہ کروں(68)

جس طرح فرد کی ذمہ داری ہے کہ اجتماعیت کا خیال رکھے اسی طرح اجتماع کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ فرد کے باطن اور ظاہر کی ضروریات اور اس کی آزادی کا نہ صرف خیال رکھے بلکہ حفاظت کرے۔ جب اجتماع فرد کی آزادی اور اس کے باطن و ظاہر کا خیال نہیں رکھتا تو فرد کی انفرادیت کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ ہیجانی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں مایوسی جنم لیتی ہے اور بسا اوقات خودکشی تک جا پہنچتا ہے۔ بقول قمر رضا شہزاد:

لوگوں کو چبھ رہی ہے مری روشنی بہت

شاید میں آفتاب سے پہلے بجھایا جاؤں(69)

معاصر غزل گو شاعر اختر عثمان خالصتاً وجودی فکر کے شاعر نہیں ہیں وہ مختلف ڈگر کے شاعر ہیں لیکن ان کے ہاں کچھ ایسا مواد ضرور موجود ہے جسے وجودیت کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فرد کی آزادی، انسان بحیثیت ماورائیت کا مرکز، خود مختاری اور داخلی کیفیات کی طرح اختر عثمان کے ہاں اجتماعیت کا تصور بھی ملتا ہے جہاں وہ اپنی ذات سے نکل کر دوسروں کے لیے فکر مند دکھائی دیتے ہیں اور انھیں آئندہ خطرات سے آگاہ کرتے کرتے خود شکست وریخت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اب شوقِ فروغِ خواب نہیں، ترویجِ جنوں کی تاب نہیں

میں اپنی خبر سے ٹوٹ گیا دنیا کو خبر کرتے کرتے(70)

اختر عثمان اپنے شعری مجموعے "ابدتاب" میں بڑا واضح اپنا فیصلہ سناتے ہیں کہ میں زمین کا پالا ہوا زمین والوں کے ساتھ ہوں کسی آسمان پر تکیہ نہیں کرتا گویا میں اپنے لوگوں کے لیے ہوں اور لوگ میرے لیے۔ میں کسی آسمان کے نسب سے نہیں ہوں۔ میں آسمان زاد نہیں ہوں:

میں زمیں نژاد، زمین زاد کے ساتھ ہوں

مرا آئنہ وہ فلک نسب نہیں بن سکا(71)

اسی طرح اسی شعری مجموعے میں اختر عثمان محبتِ یاراں کو یاد کرتے ہیں وہ بکھری ہوئی مجلس کو پھر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ فرد کو اجتماع کی ضرورت ہے اور وہ اسی ضرورت کے پیشِ نظر پوچھتے پھر رہے ہیں:

کہاں گئی وہ بزم بولتی ہوئی

خموشیو بتاؤ سب کہاں گئے

جو اپنے مدعا کے شب چراغ تھے

وہ بوزرانِ بے طلب کہاں گئے(72)

اختر عثمان جب اہلِ دل کے رویے سے اکتا جاتے ہیں تو پھر ان سے کنارا کشی اختیار کرنے اور خامشی اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرد جب اجتماع کے رویے سے تنگ ہو تو بیگانگی، کم مائیگی اور احساسِ تنہائی کا غلبہ ہونے لگتا ہے جو کہ وجودیت کی خاص اصطلاحات ہیں۔ایسی صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے وہ مزید تنہائی اختیار کر لیتا ہے۔

حسن تو انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج میں ہے قطرہ سمندر رہے اور سمندر کو خطرہ ہے۔اختر عثمان جب اجتماع کے ساتھ چل نہیں پاتے تو کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

جب یہ مزاج ہے تو پھر دہر سے رسم وراہ کیا

شکوہِ شیخ و شاہ کیا، گریہ گاہ گاہ کیا(73)

درج بالا وجودی مفکرین کی آرا اور معاصر غزل گو شعراء کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد ہم وجودیت کے تناظر میں آزادیِ انتخاب کے باب میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اجتماع فرد سے ہے اور فرد کو اجتماع کی ضرورت ہے۔ در حقیقت سارا حسن ہی انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج میں ہے۔

د: داخلی کائنات و باطن کی اہمیت

جب مذہبیت، مادیت، معاشرت، مشینیت اور دیگر عوامل مل کر انسان کی آزادی کو سلب کر لیتے ہیں تو اس کی باطنی دنیا میں ایک طلاطم خیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ داخلی کائنات ہنگامہ خیز ہو جاتی ہے اور کئی وجودی کیفیات کا ظہور ہوتا ہے جن میں مغائرت، بیگانگی اور اجنبیت سرِ فہرست ہیں۔آگے چل کر انسان دنیا کو لغویات میں شمار کرنے لگتا ہے۔اس طرح عدمیت اور لاشئیت کا جنم ہوتا ہے جس سے لاتعلقی پیدا ہوتی ہے اور انسانی باطن، اس کی داخلی کائنات مختلف کیفیتوں کو جنم دیتی ہے۔ جن میں مایوسی، اضطراب، غمگینی، افسردگی، بوریت، ذمہ داری، نفی و انکار، واقعیت، بیگانگی، ابہام، کراہت، جرم، خود کلامی، غیر معقولیت، خوف، خارجی و داخلی انکار، مظہریت اور اسی طرح کی کئی دوسری کیفیات شامل ہیں۔ تمام وجودی فلاسفہ کا یہ ماننا ہے کہ عقل حقیقتِ مطلق کا ادراک کرنے سے قاصر ہے اس لیے سائنسی طریقہِ تحقیق صداقت کی تلاش نہیں کر سکتا۔ عقل پسندی انسانی وجود کے لیے مختلف صورتوں میں خطرہ بن کر سامنے آئی جیسا کہ فسطائیت، سامراجیت،

نوآبادیاتی نظام اور کارپوریٹ سیکٹر۔ انسانی وجود کو نقصان پہنچانے والے عقلی کرشمے ہی تو ہیں۔ ڈاکٹر شاہین مفتی داخلی کائنات کے بارے میں لکھتی ہیں:

"آزادی کے تصور کی سلبیت انسان کے اندر ، بیگانگی، مغائرت اور اجنبیت کے اثرات پیدا کرتی ہے۔ اجنبیت، بیگانگی کی وجودی کیفیات شدید کرب ناکی کا احساس لیے ہوتے ہیں۔ جس طرح بیگانگی مذہب میں انسان اپنی ذات کے بہترین اوصاف مذہبی اداروں کی شکل میں منجمد کر کے خود بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ انسان کی ذات پر مسلط ہو کر افلاس کی اس صورتِ حال کو جنم دیتا ہے جو لاتعلق اور اجنبیت کے انجماد کی مثال بن جاتی ہے۔ وجود کی مصیبت ان دونوں سے بڑی ہے۔ وہ ہستی و نیستی کے تجربے سے دوچار ہو کر داخلی صورتِ حال میں جاگزیں ہوتا ہے اور اس بصری کائنات میں اس کی حیثیت لامکانی کی سی ہو جاتی ہے۔"(74)

صرف ایسا ہی نہیں ہے کہ آزادی کے سلب ہونے سے درونِ ذات شاعر پیدا ہوتا ہے بلکہ مکمل آزادی بھی داخلیت پر اثر انداز ہوتی ہے خاص کر جب آزادیِ انتخاب اور آزادیِ عمل کی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تو تب ذمہ داری قبول کرتے ہوئے فیصلے کرنے ہوتے ہیں جہاں وجودیت کی اصطلاح دہشت جنم لیتی ہے۔ خوف خارجی اور دہشت داخلی عوامل کا نتیجہ ہے۔ اسے حوالے سے افتخار بیگ کرکیگارڈ کے نظریات کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"دہشت کا تعلق آزادی کے ساتھ بھی ہے۔ فرد عمل میں آزاد ہے مگر عمل سے پہلے فرد میں غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا کرتا ہے۔ وہ بھی دہشت کا باعث بنتی ہے آزادی کی کوکھ سے امکانات جنم لیتے ہیں اور امکانات کے انتخاب میں فرد کو جس اضطراب اور بے چینی سے گزرنا پڑتا ہے وہ دہشت کا باعث بنتے ہیں۔"(75)

معاصر غزل گو شاعر میر احمد نوید کا کلام داخلی کائنات کا خوب صورت عکاس ہے۔ ان کی مجموعی فضا بھی داخلیت کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ ان کے شعری مجموعے اپنے ناموں کی طرح وجود اور موجود، ہاں اور نہیں کے درمیاں ہیں جن میں شاعر وجود کی تلاش میں ہے خارجی عوامل کا باطن پہ اثر دیکھتا ہے اور خارجیت سے داخلیت کی طرف سفر کرتا ہے وہ اپنے

اندر پیدا ہونے والی کیفیات پہ حیران ہے اور سوال کرتا ہے کہ یہ کیفیات کیوں ہیں؟ اور پھر اپنے اندر جھانکتا ہے اور اپنی ذات کو تلاش کرتا ہے۔

طربیہ کیا، المیہ کیا، ہے نغمہ کیا، ہے نوحہ کیا

ہنسایا جا رہا ہوں میں رلایا جا رہا ہوں میں

میں کیا ہوں، کون ہوں، کیوں ہوں، کہاں ہوں، کس لیے ہوں

سوالِ ہست ہوں 'ھو' میں چھپایا جا رہا ہوں(76)

جیسا کہ مضمون کے آغاز میں وجودیوں کی آرا کے مطابق کہا کہ آزادی کے سلب ہو جانے سے داخلی دنیا میں بہت فرق پڑتا ہے اور انسان میں مختلف کیفیات جنم لیتی ہیں بالکل کچھ ایسا ہی معاملہ میر احمد نوید کو در پیش ہے انھیں اذیت پہنچا کر ان کے اندرون کو بے حسی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے جس سے فرد کی آزادی کا تصور مجروح ہوتا ہے۔

لگا کر زخم، اذیت دے کے، غم میں مبتلا کر کے

بڑی بے رحمی سے بے حس بنایا جا رہا ہوں میں(77)

انسان کے باطن کی اہمیت کے باب میں یہ بات کافی ہے کہ انسان اپنے محسوسات اور اپنے جذبات کے باعث انسان ہے وگرنہ مشین ہوتا۔ خارجیت داخلیت پر پوری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح فکری مدار میں بھی انسانی وجود کئی مشکلات سے گزرتا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک ایک اور اہم اور بڑا مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ انسان آیا کہاں سے ہے؟ چونکہ انسانی عقل اس کا جواب ہنوز تلاش نہیں کر سکی اس لیے بسا اوقات انسان اجنبیت محسوس کرتا ہے اور بیگانگی کی حالت میں چلا جاتا ہے جو کہ باطنی حالت ہے۔ میر احمد نوید کو بھی کچھ ایسے ہی سوالات سے علاقہ ہے وہ بھی اجنبیت کا شکار ہیں اور اس سوچ میں گم ہیں کہ ہم کہاں سے آئے ہیں؟

کیا کہیں کس جہاں سے آئے ہیں

کون ہیں ہم، کہاں سے آئے ہیں

اجنبیت اور اس قدر حضرت

آپ کیا آسماں سے آئے ہیں(78)

دہشت اور وحشت کی حالتیں بھی داخلیت کے زمرے میں آتی ہیں۔ایک طرف خوف اور سراسیمگی ہے تو دوسری طرف گھٹن، کرب اور اذیت ہے۔یہ گھٹن خارجی عوامل کے سبب بھی ہو سکتی ہے اور دیگر باطنی کیفیات کے سبب بھی یا اجنبیت اور غیر مانوسیت کے باعث بھی ہو سکتی ہے۔میر احمد نوید مغائرت کا شکار ہیں وہ ہاں اور نہیں کے درمیاں تشکیک میں مبتلا ہیں ایسی صورتِ حال ہے کہ وحشت جنم لے رہی ہے۔

کوئی حالت نہیں یہ کون سی حالت میں ہوں

کیا خدا ہے ہی نہیں کس لیے وحشت میں ہوں(79)

داخلی کائنات کا مطالعہ وجودیت کے تناظر میں کیا جائے تو لغویت، عدمیت اور لاشئیت کے ساتھ ایک اصطلاح بے معنویت کی بھی استعمال ہوتی ہے گویا ہمارا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا ہمارے معاصر غزل گو شاعر میر احمد کو بھی یہی مسئلہ درپیش ہے وہ ہونے نہ ہونے، وہم، حقیقت اور لایعنی ویعنی کے درمیان الجھے ہوئے ہیں۔

نہ نظارہ نہ حیرت چاہتا ہوں

خدایا، معنویت چاہتا ہوں

ابھی تو وہم ہی معنی طلب ہے

اور اس پر میں حقیقت چاہتا ہوں

ورائے بحثِ لایعنی ویعنی

میں، ہونے کی وضاحت چاہتا ہوں(80)

میر احمد نوید اس بات کے قائل ہیں کہ وجود کے اندر در کھلا ہونا چاہیے۔اس شخص کی تمام تر دربدری اور کوشش حقارت گئی جو وجود کے اندر در نہیں کھول سکا ان کے نزدیک باطن کی بے حد اہمیت ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ جس پر درونِ ذات کا منظر نہیں کھلا اسے لحہ لحہ اپنی خود نگاہی پہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہر لحہ خود نگاہی پہ اپنی کرے وہ غور

جس پر درونِ ذات کا منظر نہیں کھلا

یہ جان لے کہ دربہ دری بھی نہ راس آئی

گر کوئی در وجود کے اندر نہیں کھلا(81)

معاصر غزل گو شاعر صابر ظفر کے ہاں فرد کی داخلی دنیا اور باطن کی اہمیت کے حوالے سے وجودیت کے تناظر میں خاصے اشعار موجود ہیں۔وجودیت فرد کے جس خوف، بیگانگی اور ڈر سے بحث کرتی ہے۔صابر ظفر کے ہاں بھی اس نوعیت کا ڈر اور خوف موجود ہے لیکن انھیں یہ خوف اوروں سے زیادہ اپنے ہی وجود سے ہے۔یاسیت کا احساس غالب ہے اور زندگی کی بے مائیگی کا شدید احساس بھی موجود ہے۔اپنے بیالیسویں شعری مجموعے "دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں" میں کہتے ہیں:

اندیشۂ دہر میں نہیں گم

پیدا شدہ اپنا آپ ڈر ہوں

ہاری ہوئی زندگی ہے میری

اک سانس ہوں اور آہ بھر ہوں(82)

صابر ظفر کا درج ذیل شعر وجود کا نوحہ ہے۔یہ شعر ایک ہی وقت میں وجودیت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کر رہا ہے۔اس میں باطنی کرب،خوف،مایوسی اور بیگانگی کی کیفیات بہ درجہ اتم موجود ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انفرادیت کھو جانے کا بھی نوحہ ہے۔ایک تو داخلی دنیا میں بھونچال پیدا ہے دوسرا انفرادیت کھو جانے کا دکھ ہے۔اسی بیگانگی اور انفرادیت کے کھونے کے مختلف محرکات ہو سکتے ہیں۔کارپوریٹ سیکٹر کا مشینی اور ظالمانہ عمل، جمہوری اقدار پر پابندی اور آمریت کا چلن یا نظریاتی سطح پہ عدمیت اور لاشئیت کا شکار ہونا بھی شاعر کے لیے ایسے احساسات پیدا کرنے کا محرک ہو سکتا ہے۔

بیگانگی کے دکھ سے یہ بکھرے ہوئے وجود

کثرت سے پوچھتے ہیں کہ وحدت کو کیا ہوا(83)

اسی طرح وہ اپنے شعری مجموعے "آواز کی لہر پر چلا میں" میں اندرون میں ہونے والی شکست وریخت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک باطن میں ہلچل، آرزوؤں اور تمناؤں کے خون ہونے سے ہے۔ وہ اس شکستگی سے خوف زدہ ہیں اور اپنے اندر کی توڑ پھوڑ سے ڈرے ہوئے ہیں۔

آوازِ شکستِ آرزو تھی

اکثر جسے سن کے ڈر سکے ہم(84)

بقولِ خورشید رضوی:

"ایک طرف انھیں اپنی ذات سے باہر دیکھنا گوارا نہیں اور دوسری طرف وہ ممکنات سے باہر کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کی سنگینی کو نشہ و سرمستی سے سہل بنانے کے قائل نہیں اور ذاتی غموں کو عبور کر کے کائناتی حزن کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں۔"(85)

طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

"شاعر نے اپنے باطن میں ایک تخلیقی استفسار کا جتنا وجدانی سفر کیا ہے اس نے بلاشبہ ایک نئے شعری لحن کی دریافت کے ساتھ ساتھ وجود و عدم، حاضر و غائب، ظاہر و باطن اور عکس و معکوس کے مابین وصال کی کیفیت کو جنم دیا ہے۔"(86)

معاصر غزل گو شعراء کے ہاں باطنی کیفیات میں سے احساسِ بیگانگی بڑی شدت سے پایا جاتا ہے۔ قمر رضا شہزاد انھی میں سے ایک ہیں جو متذبذب بھی ہیں اور پر تشکک بھی۔ جن کے ہاں اجنبیت بھی ہے اور بیگانگی بھی۔ انھیں زندگی کی کم مائیگی کا بھی پوری طرح احساس ہے۔ وہ خاکی وجود کے لیے دوسروں کے ساتھ جنگ کرنے کو ہر گز ہر گز ترجیح نہیں دیتے وہ بیگانگی کی اس سطح پر ہیں جہاں مزاحمت کی بجائے نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ آزادی سلب ہونے سے داخلی کائنات

متحرک ہو یا بے پناہ آزادی حاصل ہونے سے، کارپوریشن سیکٹر کا چکرویو ہو یا سماج کی پابندیاں، جو بھی محرک ہو قمر رضا شہزاد جہاں کی تمام تر فتنہ سامانیوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں اور انکار کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔

منہدم ہوتا ہوا یہ خاکداں میرا نہیں

میں نے سب سے کہہ دیا کچھ بھی یہاں میرا نہیں

اس وجودِ خاک پر کیا دوسروں سے جنگ ہو

چھوڑ جاؤں گا کسی دن یہ مکاں میرا نہیں(87)

وہ باطن کی دنیا پر بھرپور توجہ دیتے ہیں اندرون میں ہونے والی شکست وریخت سے باخبر ہیں مثلِ غبار اپنے ہی اندر بھرے ہوئے ہیں اور آپ ہی وجود سے ڈرے ہوئے ہیں۔ اپنے شعری مجموعے "شش جہات" میں کہتے ہیں:

غبار ہوں اور اپنے اندر بھرا ہوا ہوں

کسی سے کیا ڈر مجھے میں خود سے ڈرا ہوا ہوں(88)

انسان کی باطنی دنیا کی دریافت میں قمر رضا شہزاد بہت پُر امید ہیں کہ ایک نہ ایک دن سینہ چاک ہو کے رہے گا اور سبھی طلسمات ہم پہ کھل جائیں گے۔ جس طرح باہر کی دنیا وسیع و عریض ہے ایسے ہی اندرون میں باغ لگا ہوا اور اندر کی دنیا وسیع اور گہری ہے۔ شاعر اندر کی دنیا کا سفر کرتا ہے اور اسے امید ہے کہ وہ ایک دن ظفریاب لوٹے گا۔

ہو جائے گا بھیدوں سے بھرا سینہ کبھی چاک

کھل جائیں گے اک روز طلسمات ہمارے(89)

وجود کا بوجھ اٹھائے ہوئے لوگ اگر پوری استقامت سے ذمہ داری نہیں اٹھائیں گے تو لڑکھڑا جائیں گے باطن کی دنیا میں پائیداری اور ٹھہراؤ نہیں آئے گا تو کیا بعید کہ اپنے ہی ملبے تلے دب کے مر جائیں ایسی ہی حالت سے دوچار ہیں قمر رضا شہزاد جو بدن کی شکستہ حالی سے لرزیدہ ہیں.

میں دب نہ جاؤں کسی روز اپنے ملبے میں

مرے بدن کے بھی بام و در شکستہ ہیں(90)

قمر رضا شہزاد جانتے ہیں کہ فرد نے اپنے وجود کی بقا کی جنگ آپ لڑنی ہے۔اس کے لیے پہلے اپنے باطن پر توجہ دینا ہو گی۔ داخلی کیفیات سے نمٹنا ہو گا۔اپنے اندرون سے فتح یاب ہو کر باہر کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور اپنی بقا کو یقینی بنانا ہو گا۔ وجودیت میں سارتر ذمہ داری اٹھانے پر بہت زور دیتا ہے۔ذمہ داری اٹھانے کے لیے لازم ہے کہ فرد اپنے اندرون کو ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار کرے کہ اس مرحلے سے گزرے بغیر فرد اپنے ہی فیصلوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ہے۔ وجود کو مصائب کے لیے تیار کرتے ہوئے اپنے اندر ایک زبردست لڑائی لڑنی ہوتی ہے جو قمر رضا شہزاد لڑ رہے ہیں۔ درج ذیل شعر ان کی داخلی دنیا کی بھرپور عکاسی کر رہا ہے:

میں یونہی اپنے مقابل یہاں نہیں آیا

مری لڑائی تو مجھ سے مری بقا کی ہے(91)

معاصر غزل گو شاعر اختر عثمان ہونے اور نہ ہونے کے درمیان سفر کر رہے ہیں۔تذبذب، تشکیک، وجود کی تلاش، اضطراب، کرب، مایوسی، بیگانگی اور عالمِ نابود و بود کے درمیان کی کشمکش ان کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔وجودِ انسانی کو یہ سوال بڑا بے چین کرتا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟اس سوال کے جواب کی تلاش انسان کے باطن کو بری طرح جھنجھوڑتی ہے اور اسے کرب ناک حالت میں مبتلا کر دیتی ہے اور پھر وہ ایسی حالت سے دوچار ہو جاتا ہے جسے وجودی انسانی باطن کے اضطراب سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ عالمِ نابود ہے یا بود ہے، کیا ہے؟

میں کہتا ہوں میں ہوں کوئی کہتا ہے نہیں میں(92)

وجودیوں کے نزدیک احساسِ تنہائی داخلی وجود کی ایک نمایاں حالت ہے۔ جو اجتماع سے کٹ جانے سے یا اس جہاں میں اجنبیت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔اگر فرد اجتماع سے الگ ہو جائے تو بھی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے اور اگر اجتماع کے اجتماع بھی اس دنیا کو اپنے لیے اجنبی سمجھیں یا یہاں خود کو غیر محفوظ جانیں یا پھر اپنی اصل کا پتہ لگانے میں ناکام ہو جائیں

تواحساسِ تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تنہائی وجودیت کی ایک اہم اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور یہ احساس خالصتاً داخلی کیفیت ہے۔ اختر عثمان کربِ تنہائی میں مبتلا ہیں اور ان کے اندر ایک سکوت طاری ہے وہ اپنے باطن کو اس احساس کے سبب شہرِ خموشاں قرار دیتے ہیں۔

ایک تنہائی سی ہے خانۂ دل میں اختر

اک خموشی ہے یہاں شہرِ خموشاں جتنی (93)

خارج کا باطن سے گہرا تعلق ہے جہاں انسان اپنے اندر ہی اندر اپنے اندرون سے لڑ رہا ہوتا ہے وہیں خارجی عوامل بھی داخلی کائنات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے معاصر غزل گو شعراء کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہ یک وقت خارج اور باطن سے نبرد آزما ہیں۔ ان کا باطن دونوں محاذوں پر اپنی بقا کی کوشش میں رہتا ہے۔ ہمارے شعراء حالاتِ حاضرہ کی برہمی اور انتشار سے بھی متاثر ہیں اور نظریاتی یا فکری سطح پر بھی مشکلات سے دوچار ہیں۔ ایک طرف ہونے نہ ہونے کا مسئلہ درپیش ہے تو دوسری جانب روٹی کے لالے پڑے ہیں۔ آزادیِ اظہار پر بندش کی اذیت ہے اور کارپوریٹ ورلڈ کی ستم ظریفی اور عیاری ہے۔ یہ سب عوامل مل کر شاعر کے باطن کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ شعری مجموعے "ابدتاب" میں اختر عثمان اپنے باطن کے سوز کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

جو لہو میں ہے رواں درد کی صورت اختر

کیا عجب وہ بھی مرا سوزِ دروں دیکھتی ہو (94)

درج بالا مباحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسانی باطن اور اس کی داخلی کائنات اہمیت کی حامل ہے۔ انسان اپنے جذبات اور احساسات کے سبب ہی انسان ہے۔ وہ خارج سے متاثر ہوتا ہے اور خارجی حالات اس کے باطن کو شکست و ریخت کی طرف دھکیلتے ہیں۔ معاصر اردو غزل گو شعراء کا مسئلہ یہ ہے کہ انھیں جو حالات میسر آئے اور جو خارج ملا اس نے ان کی باطنی دنیا میں بھونچال پیدا کر دیا۔ آزادی کے سلب ہونے سے اور کارپوریٹ سیکٹر کے ظالمانہ طریقے سے ہمارے شعراء وجودی سطح پر متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں احساسِ تنہائی، بیگانگی، کرب، مایوسی، خوف اور بے یقینی جیسی کیفیات جنم لیتی دکھائی دیتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔اقبال آفاقی،ڈاکٹر،مابعد جدیدیت: فلسفہ وتاریخ کے تناظر میں،مثال پبلشرز،فیصل آباد،طبع اول ۲۰۱۳،ص ۱۳۸

2۔احمد نوید،میر،وجود،بالاج،پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۹۰ء،ص ۱۹

3۔ایضاً،ص ۳۶۸

4۔احمد نوید،میر،موجود،بالاج،پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۹۰ء،ص ۱۲۰

5۔ایضاً،۲۰۰

6۔احمد نوید،میر،ہاں اور نہیں کے درمیاں،بالاج،پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۹۴ء،ص ۵

7۔ایضاً،۱۷

8۔ایضاً،۳۶

9۔صابر ظفر،آتشِ بیگانگی،رب پبلشرز،کراچی،طبع اول ۲۰۲۱ء،ص ۲۲

10۔ایضاً،ص ۲۳

11۔ایضاً،ص ۳۲

12۔ایضاً،ص ۳۷

13۔ایضاً،ص ۶۸

14۔صابر ظفر،روحِ قدیم کی قسم،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،طبع اول ۲۰۱۸ء،ص ۴۸

15۔ایضاً،ص ۵۵

16۔ایضاً،ص ۸۴

17۔صابر ظفر،دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں،رنگ ادب پبلی کیشنز،کراچی،طبع اول ۲۰۲۰ء،ص ۲۳

18۔ایضاً،ص ۲۰

19۔قمر رضا شہزاد،شش جہات،شرکت پرنٹنگ پریس،لاہور،طبع اول ۲۰۲۱ء،ص ۶۱

20۔ایضاً،ص ۱۳

21۔ہارون الرشید تبسم،تبصرے ہارون الرشید تبسم کے (خاک زار،مصنف: قمر رضا شہزاد)،(تبصرہ) مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق،شمارہ نمبر ۹،بکسن پرنٹر،گلشنِ راوی،لاہور،۲۰۲۱ء،ص ۱۲۹

22۔قمر رضا شہزاد،خامشی،شرکت پرنٹنگ پریس،لاہور،طبع اول ۲۰۱۹ء،ص ۱۵

23۔ایضاً،ص ۱۹

24۔ایضاً،ص ۱۰۵

25۔ایضاً،ص ۱۳۶

26۔قمر رضا شہزاد،پیاس بھرا مشکیزہ،وراق پبلی کیشنز،لاہور،طبع چہارم ۲۰۱۷ء،ص ۱۷

27۔ایضاً،ص ۱۱۹

28۔اختر عثمان،چراغ زار،رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،راولپنڈی،طبع دوم ۲۰۱۹ء،ص ۱۸

29۔ایضاً،ص ۶۲

30۔اختر عثمان،ابدتاب،رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،راولپنڈی،طبع دوم ۲۰۱۹ء،ص ۱۹

31۔جیسپر زکارل،Six Existentialist thinker،جدید اردو نظم میں وجودیت،از شاہین مفتی،ڈاکٹر،مقالہ برائے پی ایچ ڈی،بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی،ملتان،۱۹۹۸،ص ۱۴

32۔اختر عثمان،کچھ بچا لائے ہیں،رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز،راولپنڈی،طبع اول ۲۰۱۹ء،ص ۳۳

33۔ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، مترجم: قاضی جاوید، مشعل گارڈن ٹاؤن، لاہور، س ن، ص ۴۱

34۔احمد نوید، میر، ہاں اور نہیں کے درمیاں، ص ۱۷

35۔ایضاً، ص ۲۲

36۔ایضاً، ص ۲۱۱

37۔احمد نوید، میر، موجود، ص ۲۶۴

38۔ایضاً، ص ۷۵

39۔ایضاً، ص ۱۶۴

40۔صابر ظفر، جمالِ آب سے وصال، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۲۰ء، ص ۱۰۵

41۔صابر ظفر، دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں، ص ۳۳

42۔ایضاً، ص ۶۱

43۔صابر ظفر، روحِ قدیم کی قسم، ص ۱۰

44۔قمر رضا شہزاد، ہارا ہوا عشق، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع سوم ۲۰۱۷ء، ص ۵۷

45۔ناز بٹ، قمر رضا شزاد کی "خامشی" کا دمدمہ، (مضمون) مطبوعہ: ماہنامہ ارژنگ، جلد نمبر ۲، شمارہ ۱۱، راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، لاہور، ۲۰۱۹، ص ۱۹

46۔قمر رضا شہزاد، ہارا ہوا عشق، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۶۷

47۔ایضاً، ص ۸۲

48۔قمر رضا شہزاد، یاد دہانی، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع دوم ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۶

49۔قمر رضا شہزاد، بارگاہ، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۲۰ء، ص ۱۳

50۔ اختر عثمان، کچھ بچا لائے ہیں، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص ۷۵

51۔ ایضاً، ص ۸۳

52۔ اختر عثمان، ابدتاب، ص ۸۱

53۔ اختر عثمان، چراغ زار، ص ۶۱

54۔ سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، ص ۳۸

55۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، ص ۲۴

56۔ احمد نوید، میر، موجود، ص ۲۲۸

57۔ ایضاً، ص ۱۰۹

58۔ احمد نوید، میر، ہاں اور نہیں کے درمیاں، ص ۴۷

59۔ ایضاً، ص ۲۱۳

60۔ احمد نوید، میر، وجود، ص ۱۲۵

61۔ صابر ظفر، آواز کی لہر پر چلا میں، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۱۹ء، ص ۱۵

62۔ صابر ظفر، آتشِ بیگانگی، ص ۸۱

63۔ طارق ہاشمی، جدید غزل کا باب ظفر، رنگ ادب، پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۱۵ء، ص ۶۷

64۔ صابر ظفر، روحِ قدیم کی قسم، ص ۹۷

65۔ قمر رضا شہزاد، بارگاہ، ص ۱۴

66۔ ایضاً، ص ۹۶

67۔ شازیہ رباب، قمر رضا شہزاد کا کلیات "خاک زار" (مضمون) مطبوعہ: روزنامہ جنگ، قرطاس ادب، ملتان، ۲۵ اپریل ۲۰۲۲، ص ا

68۔ قمر رضا شہزاد، بارگاہ، ص ۱۴

69۔ قمر رضا شہزاد، یاد دہانی، ص ۴۷

70۔ اختر عثمان، کچھ بچا لائے ہیں، ص ۱۱۳

71۔ اختر عثمان، ابدتاب، ص ۷۹

72۔ ایضاً، ص ۴۰

73۔ اختر عثمان، چراغ زار، ص ۹۷

74۔ شاہین مفتی، جدید اردو نظم میں وجودیت، ص ۳۲

75۔ افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفۂ وجودیت مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۳۴

76۔ میر احمد نوید، موجود، ص ۱۷۵

77۔ ایضاً، ص ۱۷۶

78۔ ایضاً، ص ۱۷۸

79۔ احمد نوید، میر، وجود، ص ۶۹

80۔ ایضاً، ص ۱۳۵

81۔ احمد نوید، میر، ہاں اور نہیں کے درمیاں، ص ۱۰۵

82۔ صابر ظفر، دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں، ص ۴۵

83۔ایضاً، ص ۹۳

84۔صابر ظفر، آواز کی لہر پر چلا میں، ص ۱۱۹

85۔خورشید رضوی، ڈاکٹر، (اقتباسات) پلکوں میں پروئی ہوئی رات، از صابر ظفر، خرم پرنٹنگ پریس، کراچی، طبع اول ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۲

86۔طارق ہاشمی، جدید غزل کا باب ظفر، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۱۵ء، ص ۷۵

87۔قمر رضا شہزاد، شش جہات، ص ۳۱

88۔ایضاً، ص ۱۲۳

89۔ایضاً، ص ۱۰۰

90۔قمر رضا شہزاد، پیاس بھرا مشکیزہ، ص ۶۱

91۔قمر رضا شہزاد، بارگاہ، ص ۸۶

92۔اختر عثمان، کچھ بچا لائے ہیں، ص ۲۶

93۔ایضاً، ص ۷۸

94۔اختر عثمان، ابد تاب، ص ۸۷

باب سوم: منتخب معاصر اردو غزل گو شعرا کے ہاں آزادیِ عمل کے عناصر

الف: فرد کی آزادی اور آزادیِ عمل

وجودیوں کے مطابق انسان اچھا یا برا کچھ بھی نہیں ہے وہ جو کچھ بھی بنتا ہے اپنے عمل سے بنتا ہے۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ اس لیے اسے آزاد رہنے کا حق ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اعمال و افعال اپنی مرضی سے سرانجام دے۔ جب تک اسے سوچ، ابلاغ، انتخاب اور عمل کی آزادی نہیں دی جائے گی وہ اپنی ذات کی تشکیل نہیں کر پائے گا۔ سوچ، ابلاغ اور انتخاب کے مراحل طے کر لینے کے بعد عمل ہی ایسا مرحلہ ہے جو انسان کی تشکیل کو یقینی بنا سکتا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک فرد کو عمل کی آزادی کا حق دینا ہی فرد کی اصل آزادی ہے۔ فیصلہ کرنے کے بعد جب تک فیصلے کو عملی شکل نہ دی جائے گی تب تک فیصلہ کارگر ثابت نہ ہو گا۔ وجودیت کے تناظر میں انسان دوستی اور فرد کی آزادی کے عناصر سب سے زیادہ سارتر کے ہاں ملتے ہیں۔ سارتر اپنی کتاب Being and Nothingness کے چوتھے اور آخری باب میں تصورِ آزادی پہ روشنی ڈالتا ہے اور آزادی کو عمل سے منسوب کرتا ہے۔ آزادی کے تصور کے ضمن میں ژاں پال سارتر کی اس کتاب کا یہ باب خاص اہمیت کا حامل ہے۔

"جہاں وہ موجودگی اور عمل کو آزادی سمجھتا ہے، حرکت کو آزادی کی پہلی شرط قرار دیتا ہے، صورتِ حال کو آزادی کی واقعیت بیان کرتا ہے اور پھر ذمہ داری کو آزادی کا نتیجۂ فکر ثابت کرتا ہے"(1)

سارتر جس آزادی کو حرکت سے شروع کرتا ہے آگے چل کر اسے مشکل بناتا جاتا ہے اور یہاں تک کہ عمل کو ذمہ داری سے مشروط کر دیتا ہے۔ آزادیِ عمل کو واضح کر دینے کے بعد سارتر کے نظریات کے مطابق کوئی خدا موجود نہیں جو انسان کے کیے کا بوجھ اٹھائے یا اس کی راہنمائی کرے اس لیے انسان کو اپنی رہبری خود کرنی ہے۔ اپنے فیصلے خود کرنے ہیں اور ان فیصلوں پر عمل بھی خود کرنا ہے جب انسان سبھی کچھ خود کرے گا تو پھر اپنے کیے گئے اعمال کا بوجھ بھی خود اٹھائے گا گویا انسان کو اپنے اقوال و افعال کی مکمل ذمہ داری اٹھانی ہے جو کہ مشکل ترین کام ہے۔ وجودیت میں فلسفۂ عمل و ذمہ داری کے ضمن میں سارتر انسان کے لیے کہتا ہے کہ وہ اپنی آزادی اور انتخاب کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ وہ خود ہی تمام اقدار کا

خالق ہے۔ انسانی وجود کی جو بھی قدر و قیمت ہے وہ خدا کے وجود کے صریح انکار اور انسانی آزادی اور لازماً ذاتی ذمہ داری میں پوشیدہ ہے۔

آزادیِ عمل کے باب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں فرد اپنے نجی ایجاب وارتکاب میں آزاد ہے اور عمل میں آزاد ہے وہی فرد پوری طرح اپنی آزادی کا ضامن اور اپنے افعال کا ذمہ دار بھی ہے۔ معاصر اردو غزل گو شعراء میں فرد کی آزادی کا تصور بہ درجہ اتم موجود ہے اور وہ آزادیِ عمل کے پرچارک بن کر سامنے آرہے ہیں۔ میر احمد نوید ان میں سے ایک ہیں جو اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں اور اپنے لیے زمانے کی تشکیل بھی خود کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ فرد آزاد ہے اس دنیا کو اپنے عمل سے اپنے مطابق بنانے کے لیے اپنے شعری مجموعے "وجود" میں زمین کی خرابیوں اور افلاک کی ہلاکتوں و آفتوں کے بیچ ایک نیا زمانہ بنانے کی بات کرتے ہیں۔

زمیں کی چند ایک خرابیاں بھی نویدِ تعمیرِ نو بنی ہیں

ہلاکتِ ہفت آسماں سے نیا زمانہ بنا رہا ہوں(2)

وہ سمجھتے ہیں کہ فرد ہی مرکز و محور ہے اور وہی حقیقت کا وزن اٹھانے کے لائق ہے اور لیل و نہار کھینچ سکتا ہے۔

ہمی ہیں جو حقیقت کا وزن اٹھائے ہوئے

مہارِ ناقۂ لیل و نہار کھینچتے ہیں(3)

زندگی حرکت و عمل کا نام ہے جب کہ سکوت موت ہے کارِ جہاں کی دشواریوں اور اذیتوں میں ایک قدم اٹھانا بھی سہل نہیں لیکن وجود کی تعمیر کے لیے حرکت و عمل کو اپنانا اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے میر احمد نوید اس صورتِ حال کا نقشہ کچھ یوں کھینچتے ہیں:

اٹھانا اک قدم بھی تھا جنوں کے ضعف سے مشکل

اٹھا جب اک قدم طے دشتِ امکاں کر لیا میں نے(4)

میر احمد نوید کافرانہ حد تک آزادی چاہتے ہیں ایسی آزادی جہاں کوئی خدا دخل نہ دے نہ خدا کے نام پہ خلقِ خدا مجبور کرے وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال میں اس قدر آزاد ہوں کہ مسجد کو مے خانہ اور بت خانے کو کعبہ کر ڈالیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ فرد کو اس جہاں میں جہاں سے بھی پھینکا گیا ہے۔اس سے قطعِ نظر یہ دیکھنا چاہیے کہ فرد نے اسی زمین پر رہنا ہے اور خود اعمال وافعال کی ذمہ داری اٹھا کے اپنے اور دوسروں کے حق میں بہتر کرنا ہے۔یہی تو وجودیوں کا نقطہِ نظر ہے۔آزادیِ عمل کے باب میں کہتے ہیں:

کیا کروگے جو میں مسجد کو کروں مے خانہ

کیا کروگے جو میں بت خانے کو کعبہ لکھ دوں(5)

سارتر کے فلسفہِ عمل وذمہ داری کو سمجھنے کے لیے میر احمد نوید کا درج ذیل شعر خاصی اہمیت کا حامل ہے۔اس شعر میں میر احمد نوید کہتے ہیں کہ میں خدا نہیں کہ لوگوں کا حساب رکھوں کہ کسے کیا مل گیا ہے یا کسے کیا چاہیے ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ خدا ہوتے تو دوسروں کی ضرورت کا خیال رکھتے یعنی اپنے ساتھ دوسروں کی ذمہ داری بھی قبول کرتے اور دھیان رکھتے کہ کسے کیا ملا ہے اور کسے کیا چاہیے ہے۔الحادی وجودیوں نے خاص کر سارتر نے یہ کیا کہ خدا کو انسان سے بدل دیا یعنی انسان کو خدا کی جگہ رکھ دیا اور خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کام خدا نے کرنا تھا اب وہ انسان نے خود کرنا ہے یعنی اپنے علاوہ دوسروں کا خیال بھی رکھنا ہے اور اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری بھی اٹھانی ہے۔بقولِ میر احمد نوید:

میں خدا تو نہیں میں کیوں رکھوں ایک اک کا حساب

کسے کیا مل رہا ہے اور کسے کیا چاہیے ہے(6)

اسی بات کو ذرا مختلف انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب انسان پر اس کا آپ کھل جاتا ہے تو وہ جان جاتا ہے کہ در حقیقت اس کے ہونے میں ہی خدا ہے۔

کھلے گا تجھ پر جس دم تیرا ہونا

کھلے گا تیرے ہونے میں خدا ہے(7)

میر احمد نوید کے نزدیک زندگی کا دارومدار اعمال وافعال پر ہے گویا حرکت میں زندگی ہے یہ سانسوں کے آنے جانے کو حیات نہیں کہتے ہیں بلکہ وجود کی تعمیر وتشکیل اور بھرپور زندگی کے لیے اپنے فیصلوں اور اپنے عمل کی آزادی پر انحصار کیا جاتا ہے۔

سانسوں کے آنے جانے کو سمجھا ہے تو حیات

کہتے ہیں کس طریق کو جینا سمجھ تو لے(8)

آزادیِ عمل سے مراد ہے کہ چاہے فرد کے نجی وذاتی معاملات ہوں، روزمرہ کے افعال ہوں یا بڑی سطح پر افکار کو عملی جامہ پہنانا ہو تو فرد آزاد ہو کہ وہ اپنی ذاتی زندگی اور دوسروں سے وابستہ امور کو بغیر کسی رکاوٹ کے عملی شکل دے جس سے اس کی اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگی کو فائدہ پہنچے۔ فرد کی اور معاشرے کی بہتر تشکیل ہو سکے۔ معاصر غزل گو شاعر صابر ظفر اپنے افکار وانتخاب کی طرح اپنے عمل میں بھی بھرپور آزاد نظر آتے ہیں۔ نہ صرف عمل میں آزاد بلکہ اپنے عمل کی پوری ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے جیسے دیگر افراد کی خاطر جان قربان کرنے تک کے اعلیٰ مقاصد کے لیے خوشی خوشی سوئے دار چل پڑتے ہیں۔

دیکھا نہ کسی نے جانبِ دار

ہم جیسے ہی خود سروں نے دیکھا(9)

صابر ظفر کا یہ شعر ان کی فکر، انتخاب اور عمل کی آزادی کے ساتھ ساتھ ان کی ذمہ داری اور فرد کی آزادی جیسے اعلیٰ مقصد کا حامل ہے۔ صابر ظفر کے ہاں مزاحمتی انداز پایا جاتا ہے۔ وہ جس معاشرے میں رہتا ہے وہ جبر کا معاشرہ ہے اور صابر ظفر جبر کے خلاف کمر کسے ہوئے ہے وہ ایسی کوئی بندش برداشت کرنے کو ہرگز ہرگز تیار نہیں جو اسے اور اس جیسے دیگر مظلوم افراد کی آزادی کو سلب کرے۔ جب جب انسان کو آزادانہ عمل سے روکا گیا تب تب صابر ظفر سراپا احتجاج ہوئے۔ ان کا درج ذیل شعر فرد کو عمل کی آزادی دلوانے کے لیے ہے تاکہ بندشیں ختم ہوں اور فرد کی آزادی کے تصور کو عزت اور وسعت ملے۔

دیوار و در سے جس کے، قفس کا گماں ہو

ایسے مکاں میں رہنا، مکینوں کو منع ہے(10)

صابر ظفر جس معاشرے کے نمائندہ ہیں اس معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ عمل کی آزادی تو دور غاصبوں کے بس میں ہو تو آزادانہ سوچنے پر بھی پابندی عائد کر دیں۔اظہار پر پہلے ہی پہرے لگے ہوئے ہیں۔اگر اس معاشرے میں کوئی فرد آزادانہ سوچ لے،اظہار کر دے یا عمل کی کوشش بھی کرے تو یا مار دیا جاتا ہے یا اٹھا لیا جاتا ہے۔

یہ مارنے اور اٹھانے والے اپنی میزوں پر اپنی ضرورت اور اپنے مفاد کے تحت کچھ نظریات کو تراش کر دوسروں پر زبردستی عائد کرنے پر بہ ضد ہیں۔جب کوئی ان کے تراشیدہ نظریات سے نکلنے کی کوشش کرے تو وہ فکری آزادی سے آگے بڑھ کر جسمانی آزادی تک چھین لیتے ہیں ایسی صورتِ حال میں صابر ظفر میدان میں آتے ہیں اور سراپا احتجاج ہوتے ہیں ان کا درج ذیل شعر ایسے ہی مسائل کا نمائندہ ہے۔

ملیں گے اور کئی دن نہ لاپتا افراد

جو دے گی طولِ ستم، بن رہی ہے کابینہ (11)

صابر ظفر اپنی بے قراری کا حل تگ و دو میں ڈھونڈتے ہیں۔انسانی وجود دنیا میں آ کے جن مشکلات سے دوچار ہوتا ہے ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے تگ و دو لازم ہے۔ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔وجود کی بقا کے لیے حرکت و عمل کو شعار بنانا لازم ہے۔بقول صابر ظفر:

تھوڑا سا ملے قرار شاید

تھوڑی سی اگر کروں تگ و دو(12)

صابر ظفر آزادی کی شدید خواہش رکھتے ہیں لیکن زنجیریں ان کے پاؤں کا مقدر بن چکی ہیں۔ان کے باطن کی دنیا کہرام مچائے ہوئے ہے اور انھیں مر مٹنے پہ اکسا رہی ہے لیکن وہ بندشوں کا شکار ہیں۔وجودی مفکرین جذبات کے طلاطم کے آگے بند باندھ کر انسانی وجود کو مشکلوں میں ڈالنے کے حق میں ہرگز نہیں۔انھیں تو انسانی وجود کی آزادی اور آزادیِ عمل

سے واسطہ ہے لیکن جب صابر ظفر کی آزادی کے آگے بند باندھے جاتے ہیں تو وہ اپنی شدید خواہش اور بے بسی کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

جنونِ عشق ظفر توڑ دے یہ زنجیریں

اور اس پہ مر ہی مٹوں، بے قراری ایسی ہے(13)

صابر ظفر کے چوالیسویں شعری مجموعے آتشِ بے گانگی، میں شامل درج ذیل شعر وجودی تقاضوں کی عکاسی کرتے ہوئے ان کے نجی ایجاب وارتکاب کی عمدہ مثال ہے۔ ساتھ ساتھ احساسِ ذمہ داری اور آزادیِ عمل کا بھی عمدہ نمونہ ہے۔

ہم اپنی آگ کو اک دوسرے سے جب بانٹیں

یہ شعلگی نہ بجھے، طے معاملہ تب ہو(14)

اپنی آگ کو ایک دوسرے میں بانٹنا اور اس شعلگی کو نہ بجھنے دینا آزادیِ عمل بھی ہے اور احساسِ ذمہ داری بھی اور یہ آگ بانٹنے اور شعلگی کو برقرار رکھنے کا سارا عمل ان کے ذاتی و نجی ایجاب وارتکاب کا عکاس بھی ہے۔ معاصر غزل گو شاعر قمر رضا شہزاد کے ہاں آزادیِ فکر و عمل کے حوالے سے خاصا مواد موجود ہے وہ اپنی دنیا آپ بنانے پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی دنیا اجاڑنے پر بھی ان کے نزدیک فرد اپنے لیے اچھا کرے یا برا۔ اکیلا چلے یا اوروں کو ساتھ لے کر چلے یہ اس پر ہے اور اسے اپنے اعمال میں آزاد ہونا چاہیے۔ انھیں چراغ کا اعتراف کر کے ہوا کو اپنے خلاف کرنے کا اذن عطا ہوا ہے۔ وہ اپنے لیے کسی کی رفاقت کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ آپ اپنی ذات کا طواف کرتے ہیں:

ہوا کو اپنے خلاف کر رہا ہوں میں

چراغ کا اعتراف کر رہا ہوں میں

مجھے نہیں چاہیے رفاقت کسی کی

ابھی تو اپنا طواف کر رہا ہوں میں(15)

قمر رضا شہزاد سارتر کی اس رائے سے متفق نظر آتے ہیں کہ انسان کو سب کچھ اپنے لیے آپ کرنا ہے اور اس کی ذمہ داری بھی اٹھانی ہے چاہے کامیاب ہو کہ ناکام ہو۔ قمر رضا شہزاد کے بقول:

مرا کمال میں اپنی بلندیاں شہزاد

حقیر و پست مقامات سے نکالتا ہوں(16)

وجودیوں کے مطابق انسان اپنے فیصلوں میں آزاد ہے۔ چاہے تنہا رہے یا ہجوم میں اسے اپنی تعمیر و تشکیل کے لیے اپنے فیصلوں میں آزادی اور آزادیِ عمل کی ضرورت ہے۔ قمر رضا شہزاد بھی ایسے ہی نظامِ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے شعری مجموعے "پیاس بھرا مشکیزہ" میں وہ اپنے لیے ہجوم سے دور کسی پہاڑی پر اپنا ٹھکانہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آزادانہ عمل کر سکیں۔

میں گھر تعمیر کروں گا کسی پہاڑی پر

مجھے خوف آتا ہے شہروں کی آبادی سے(17)

شبہ طراز لکھتی ہیں:

> "ہم بطور انسان موت کے محض ڈراؤنے وجود سے واقف ہوتے ہیں اسی وجہ سے عموماً موت سے آنکھیں چراتے رہتے ہیں۔ لیکن شعور کی اعلیٰ سطح پر جا کر جب یہ احساس بیدار ہوتا ہے کہ موت دراصل دائمی زندگی ہے یا زندگی کا ہی ایک جز ہے تب انسان میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرات پیدا ہوتی ہے۔ قمر رضا شہزاد کی شاعری میں یہ جرات مندانہ رویہ جا بجا نظر آتا ہے۔ وہ کہیں موت کو اور کہیں موت کے خالق کو للکارتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ موت سے خوف زدہ ہونے کی بجائے اسے اپنی زندگی اور سوچ میں ہمہ وقت شامل رکھتے ہیں۔"(18)

الحادی وجودی فلاسفہ کے نزدیک مسجد و منبر یعنی مذہب فتنہ و فساد بن کر انسانی وجود کا نقصان کرتا آیا ہے۔ حالانکہ اس کا دعویٰ انسان کی بھلائی کا ہے لیکن اس کی روح جبر پسند ہے۔ وہ مجبور و بے بس شخص کو صبر کی تلقین کرتا ہے اور دلاسے کے طور پر ظالم کے جہنم کا تصور دیتا ہے۔ جب اسی مذہب میں فرقے بنتے ہیں تو فتنہ و فساد کی راہ ہموار ہو جاتی ہے یہاں تک کہ

سلسلے کشت وخون تک جا پہنچتے ہیں جہاں انسانی وجود پر خوف مسلط ہو جاتا ہے اور جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ قمر رضا شہزاد ایسے عمل کے خواہاں ہیں کہ جہاں وہ اس دہشت وخوف سے چھٹکارا پانے کے لیے منبر و محراب کو کہیں پھینک آئیں۔ فرد کی مستقل آزادی کے لیے لازم ہے کہ انھیں اس عمل کی آزادی ملے تاکہ وہ منبر و محراب سے بنی نوع انسان کی جان چھڑا سکیں۔ اس سے فرد کو مرکزیت عطا ہو گی اور وہ بغیر کسی دباؤ اور خوف کے اپنے فیصلے آپ کر سکے گا۔

مجھے نہیں ہے کسی فتنہ وفساد کا خوف

میں جب سے منبر و محراب پھینک آیا ہوں(19)

درج بالا بحث کے تناظر میں قمر رضا شہزاد کا درج ذیل شعر بھی اہمیت کا حامل ہے۔

یہی کہ صرف عقیدہ ہے مختلف تم سے

اس ایک بات پہ جی بھر کے قتلِ عام کرو(20)

سارتر نے ذمہ داری کو فرد کے عمل سے مشروط کر دیا ہے اور اسے اپنی دنیا آپ بنانے اور اپنے فیصلوں کا بوجھ اٹھانے کا درس دیا ہے۔ قمر رضا شہزاد کے ہاں انھی نظریات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جہاں وہ آسماں کو ترک کر کے زمیں کو بچانے کی بات کرتے ہیں۔

پھر آئے گی آسماں کی باری

پہلے یہ زمین تو بچا تو(21)

مذہبی چھاپ رکھنے کے باوجود معاصر غزل گو اختر عثمان کے کئی اشعار وجودی فلسفہ کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اختر عثمان کے نزدیک انسانی وجود اس زمین پر غیر محفوظ ہے۔ یہاں کسی خدا کا قبضہ واختیار نہیں یہ بے لگام دنیا ناخداؤں کی ہے، وقت خضر ہے اور یہ وقت خدا کے بغیر قابو میں ہے اب انسان ہی اپنے عمل سے کچھ کرے تو کر سکتا ہے یا پھر اسے ہی اپنی بقا کے لیے کچھ نہ کچھ ہو گا۔

یہ ناخداؤں کی دنیا ہے اور خضر ہے وقت

اور ایسا وقت جو قابو میں ہے خدا کے بغیر (22)

دیگر معاصر غزل گو شعراء کی طرح اختر عثمان کو بھی جن مسائل کا سامنا ہے وہ عمل کی آزادی نہ ہونے سے مشروط ہیں۔ اختر عثمان اس اندھیری رات میں چراغ جلانا تو چاہتے ہیں لیکن ان پہ ہواؤں کا خوف مسلط ہے۔ سماجی جبر میں ایسی جسارت کرنے کے لیے لہو کو پانی کرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ اختر عثمان سوال کرتے ہیں:

سیاہ شب میں جلانے تو جا رہے ہو چراغ

ہوا سے بات بھی کر لو گے، کیا لہو بھی ہے اور؟ (23)

اختر عثمان عملی میدان میں بھی آزادیِ عمل اور فلسفہِ ذمہ داری کے قائل ہیں۔ بقول علی بابا تاج:

"وہ شعر گوئی کو ایک بڑی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ عطائے علم کا قرض اور خرد و جنوں کے پیکار میں اسے معیار گردانںے کے علاوہ شعر گوئی کی نعمت کو ولایت سمجھتے ہیں۔" (24)

اختر عثمان انسانی خود مختاری اور آزادیِ عمل پر یقین رکھتے ہیں اگر وہ اجتماعیت کے لیے کچھ بڑا کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں تو اس قدر ہمت و جرات ضرور رکھتے ہیں کہ اپنے لیے انتخاب کر سکیں، فیصلہ کریں اور اپنی ذات کی حد تک اپنے فیصلے پر عمل درآمد کر سکیں۔ اسی لیے وہ سہل راستہ ترک کر کے مشکل راستے کا انتخاب کرتے ہیں اور زمانے کے قافلے سے پرے رواں دواں ہیں جو ان کے عمل کی آزادی کی دلیل ہے۔

جہان بھر سے جدا، سہل راستے سے پرے

رواں دواں ہوں زمانے کے قافلے سے پرے (25)

تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ وجودی فلاسفہ جس فرد کی آزادی، آزادیِ عمل، فرد کے نجی ایجاب وارتکاب اور فلسفہِ ذمہ داری کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں ان نظریات کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس عہد کی بندشیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جو معاصر شعراء کو درپیش ہیں۔ بنیادی طور پر معاصر اردو شعراء فرد

کی آزادی اور آزادیِ عمل پر زور دیتے ہیں اور سماجی جبر کے خلاف مزاحمت کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ فرد کو آزاد رہنے دو کہ وہ آزاد رہنے کے لیے ہی ہے۔

ب: وجود جوہر پر مقدم ہے

وجود جوہر پر مقدم ہے یا جوہر وجود پر مقدم ہے؟ یہ فلسفے کے دو دلچسپ مباحث ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ہم ہیں اس لیے سوچتے ہیں جب کہ دوسرے کا کہنا ہے ہم سوچتے ہیں اسے لیے ہم ہیں۔ وجودی مفکرین اول الذکر قول کے طرف دار ہیں اور یہ فارمولا انھی کا دیا ہوا ہے۔ الحادی وجودیوں میں سارتر اس پر بہت زور دیتا ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے اس کا ماننا ہے کہ انسان کہیں سے زمین پر پھینکا گیا ہے وہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اس نے کہاں جانا ہے؟ اس کو تو بس یہ پتہ ہے کہ اس نے اپنا آپ خود بچانا ہے اور خود ہی تعمیر کرنا ہے کوئی خدا موجود نہیں ہے اس لیے وہ آپ اپنا خدا ہے اس نے پہلے اپنے وجود کے تقاضے پورے کرنے ہیں کیوں کہ وہ مرکزیت کا حامل ہے اسے آزادی اور انسان دوستی کی ضرورت ہے۔ وہ ماورائیت کا مرکز ہے اور قانون ساز ہے اس کی داخلی دنیا کی اہمیت ہے اور وہ اپنے خارج میں بھی موجود ہے۔ وجود ہے تو سوچنے کا عمل ہے اور جوہر کی وقعت ہے اگر وجود نہ ہو تو جوہر کچھ بھی نہیں ہے۔ ان خیالات کا اظہار وہ اپنے مشہور خطبے "وجودیت اور انسان دوستی" میں کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

> "فرد کا وجود جوہر پر مقدم ہے۔۔۔اس سے ہماری مراد ہے کہ انسان پہلے وجود میں آتا ہے اپنی ذات کا سامنا کرتا ہے، کائنات میں ابھرتا ہے اور پھر کہیں اپنے تصور کی تشکیل کرتا ہے۔ اگر انسان کی جیسا کہ وجودیوں کا خیال ہے، پہلے سے تعریف ممکن نہیں تو یہ صرف اس لیے ہے کہ انسان ابتدا میں کچھ نہیں ہوتا وہ وہی کچھ ہوتا ہے جو کچھ اپنے آپ کو بناتا ہے اس سے قبل وہ کچھ بھی نہیں چنانچہ کوئی انسانی فطرت نہیں۔"(26)

معاصر اردو غزل گو شعراء میں میر احمد نوید ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری کو وجودیت کی بھرپور شاعری کہا جا سکتا ہے ان کے شعری مجموعے کا نام ہی "وجود" ہے اور اپنے نام کی طرح وجودیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ شعری مجموعے "وجود" کی پہلی غزل کا مطلع ہی وجود کی اہمیت اور وسعت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ نہ صرف یہ کہ پہلے شعری مجموعے کی پہلی غزل کا پہلا شعر وجودیت کے تناظر میں ہے بلکہ پہلا لفظ "میں" ہے اور آگے کی ساری شاعری اسی "میں" کی تلاش اور کھوج میں ہے۔

'میں' ہے کیا تم کو بتانے آیا ہوں

میں تمھیں تم سے ملانے آیا ہوں

پائے ہیں جس کے لیے تم نے یہ پاؤں

میں اسی رہ پر چلانے آیا ہوں(27)

میر احمد نوید اس پہلی مسلسل غزل میں 'میں' کی کھوج لگا رہے ہیں۔ اگر آنکھ بنی ہے تو اس کے لیے جلوے ڈھونڈنے ہیں، کان ہیں تو نغمے تلاشنے ہیں، حواس ہیں تو انھیں بیدار کرنا ہے، پاؤں ہیں تو چلنے کے لیے راہ بنانی ہے اور اس دوزخ نما زمیں کو جنت بنانا ہے۔ اس پوری غزل سے وجودی فلاسفہ کے کئی پہلوؤں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان نے خود کو خود دریافت کرنا ہے اور وہی کچھ بننا ہے جو اپنے حواس اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بنے گا۔ وہ پہلے سے کچھ نہیں ہے اس کا وجود اہم ہے اور اس نے اپنے وجود کی تعمیر و تشکیل خود کرنی ہے۔ اسی شعری مجموعے میں آگے چل کر میر احمد نوید وجود کی اہمیت اور مرکزیت کو بیان کرتے ہیں اور اسے جوہر پر مقدم قرار دیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ مہر و مہ و انجم اور کائنات کی وسعت اسی 'میں' سے ہے اگر فرد کا وجود ہی نہیں ہے تو پھر یہاں کوئی کھیل تماشا بھی نہیں ہے۔ سبھی طلاطم خیزی اور ہنگامہ آرائی فرد کے وجود سے ہی ہے اسی لیے اسے مرکزیت حاصل ہے:

مہر و مہ و انجم کا تماشا بھی نہ ہوتا

ہوتا نہ اگر میں تو نہ ہونا بھی نہ ہوتا

ممکن جو نہ تھا وہ بھی ہمی سے ہوا ممکن

آتے نہ اگر ہم تو تماشا بھی نہ ہوتا(28)

میر احمد نوید سارتر کے فلسفۂ وجودیت کے قائل ہیں ان کے نزدیک فرد کا وجود ہی وجود کی وحشت کو سہار سکتا ہے کوئی ایسا موجود نہیں جو اس وجود کی تعمیر و تشکیل میں معاون ہو اور وجود کی وحشتوں کو سہارے۔ بقولِ میر احمد نوید:

موجودیِ وجود کی وحشت سہارتے

ہم بھی تھے ورنہ بام و در ایسے کہاں تھے(29)

الحادی وجودی کہتے ہیں کہ انسان اس جہاں میں کہیں سے پھینکا گیا ہے جب کہ مذہبی فلاسفہ کا کہنا ہے خدا نے اسے تخلیق کیا اور پھر اسے اپنا نائب بنا کر زمین پر بھیجا میر احمد نوید کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مذہبی ماحول کے پروردہ ہیں اور دوسری طرف عقل و آگہی کو مقدس جانتے ہیں کبھی وہ مذہبی حصار سے نکلتے ہیں تو کبھی تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں اپنے شعری مجموعے "موجود" میں وہ کئی جگہ ایسی ہی متذبذب کیفیات کا شکار دکھائی دیتے ہیں جہاں وہ وجود کی اصل معلوم کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ سوال ان کے لیے پریشان کن ہے کہ انسان بھیجا گیا ہے یا پھینکا گیا ہے جو بھی صورت رہی ہو انسانی وجود یہاں وہی ہے جو وہ خود کو بنائے گا۔ میر احمد نوید کے یہ اشعار ان کے نظریات کی عکاسی کرتے ہیں:

اے خدا بھیجا ہوا ہوں کہ نکالا ہوا ہوں

اس گتھی کو میں سلجھانے میں الجھا ہوا ہوں

میں ہوں آپ اپنا سوال آپ ہوں میں اپنا جواب

خود ہی پوچھا ہوا ہوں خود ہی بتایا ہوا ہوں(30)

میر احمد نوید اپنی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے ہونے کو ثابت کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کا مذہبی معاشرہ راضی بہ رضا رہے جب کہ یہ حقیقت کی تلاش میں ہیں۔ ان کے نزدیک وجود اہمیت کا حامل ہے وہ اپنے آپ کو کھوجنا چاہتے ہیں:

تو کیا نہ ڈھونڈوں حقیقت میں اپنے ہونے کی

میں بے خیال یونہی رائیگاں چلا جاؤں(31)

میر احمد نوید وجودی فلاسفہ کی گہری چھاپ رکھتے ہیں وہ سارتر اور اس قبیل کے نظریات سے متفق ہیں کہ انسان جو کچھ بھی ہے اس نے خود کو خود بنایا ہے وجود مقدم ہے اور اسی نے اپنی تعمیر کرنی ہے۔ میر احمد نوید اپنے شعری مجموعے "ہاں اور نہیں کے درمیان" میں وجود کو مقدم قرار دیتے ہیں اور کسی غائبانہ خدا کی تلاش کو کارِ فضول سمجھتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ اگر تلاش ہی کرنی ہے تو اپنے اندر جھانک کر امکانات کا اندازہ لگایا جائے کہ وہیں سے چشمہ پھوٹے گا۔

تجھ سے یہ کس نے کہا تو ڈھونڈ ممکن میں خدا

تجھ میں پوشیدہ ہے جو امکانِ امکانات ہے(32)

ژاں پال سارتر نے اپنے خطبے " وجودیت اور انسان دوستی" میں وجود کو مقدم جان کر انسانی فطرت پہ جرح کی ہے کہ فطرت کچھ نہیں ہے وہ انسانی وجود ہی ہے جو خود کو کچھ بھی بناتا ہے۔ اس بات کو سمجھاتے ہوئے اس نے بزدل اور بہادر انسان کی مثال دی جس کا لب لباب یہ ہے کہ اگر انسانی فطرت ہے تو پھر بزدل پیدائشی بزدل ہوگا اور ہیرو پیدائشی ہیرو ہو گا۔ سارتر اس بات سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وجودی اس بات کو نہیں مانتے کہ کوئی پیدائشی بزدل یا بہادر ہو سکتا ہے بلکہ فرد نے خود طے کرنا ہے کہ اس نے کیا بننا ہے کیوں کہ بزدلی تو شکست کو قبول کرنے اور جھک جانے سے منسوب ہے۔ اگر فرد شکست قبول کر کے جھک جاتا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ بزدل ہے لیکن شکست قبول کرنا اور جھک جانا اس کا اپنا فیصلہ تھا جس سے وہ بزدل ہوا اس لیے انسانی فطرت کچھ نہیں ہے۔ انسان وہی کچھ ہے جو اس نے خود کو بنایا۔ درج بالا تمام بحث کو میر احمد نوید کے ہاں اگر لایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ میر احمد نوید بھی اسی فکر کے حامل ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب انسان خود کو پالے گا تو کسی مذہبی یا اور سہارے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قیام اور اذاں سب غیر متعلق ہوں جائیں گے۔

انساں نے اپنے بے کراں ہونے کو پالیا

کیسا قیام، کیسی اذاں، سب بدل گیا(33)

وجودی مفکرین کی طرح صابر ظفر بھی وجود کی اہمیت کے قائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ فرد نے اپنے وجود کو خود ترتیب دینا ہے اور وہی بننا ہے جو وہ بننا چاہے۔ صابر ظفر کے ہاں میر احمد نوید کی طرح مکمل طور پر وجودیت کی چھاپ تو نہیں البتہ کہیں کہیں ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں۔ جنھیں وجودیت کے تناظر میں جوہر پر مقدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ "روحِ قدیم کی قسم" کے یہ اشعار بھی وجود کی اہمیت اور وجودی فلاسفہ کی تائید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

تمھارے چار طرف روشنی تمھاری ہے

یہ روشنی ہی نہیں زندگی تمھاری ہے

چھلک رہا ہے وجود انتظار کرتا ہوا

اور اس وجود کی دوشیزگی تمھاری ہے(34)

صابر ظفر کو بھی وجود اور عدم کا سوال پریشاں کیے ہوئے ہے وہ یہ عقدہ کھولنا چاہتے ہیں لیکن وجود و عدم کی گرہیں کھل نہیں رہیں اب وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر انتہائے تحیر کا راز پا لیا جائے یا اس کی کسی صورت سے ربط پیدا ہو جائے تو ممکن ہے گرہیں کھل جائیں۔

گرہیں کھل جائیں وجود اور عدم کی شاید

رازِ اشکالِ تحیر سے اگر ربط ہوا(35)

وجودی فلاسفہ کی طرح صابر ظفر بھی انسانی وجود پر غور کرتے ہیں۔ وجود اور عدم کے بارے سوچتے ہیں اور انسانی وجود کا جائزہ لیتے ہیں لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آدمی کہاں سے آیا اسے یہاں کیا کرنا ہے اور اس نے کہاں جانا ہے؟ کیا زندگی لغو و لایعنی ہے؟ کیا زمین پر آدمی کا کوئی کام نہیں تو کیا سب بے معنویت ہے؟ یہ سب سوالات وجود اور عدم پر غور کرنے والوں پر کھلتے ہیں۔ الحادی وجودیوں نے تو یہ کہہ رکھا ہے کہ انسان کو پھینکا گیا ہے۔ صابر ظفر بھی یہ مانتے ہیں کہ آدمی کہیں سے خوار ہو کر آیا اور زمیں پر بھی کچھ نہ کر سکا اور خجل پلٹا۔ اس ساری بحث سے ایک بات تو ثابت ہے کہ آنے اور جانے کو چھوڑ کر یہ طے ہے کہ آدمی نے زمین پر رہنا ہے اور اپنی دنیا آپ بنانی ہے اب اس کے وجود پر ہے کہ وہ عزت کمائے یا خجل پلٹے۔

شاہد تھا وہ تحیرِ خلوت کا آدمی

اترا فلک سے خوار زمیں سے خجل گیا(36)

وجود و عدم کے باب میں صابر ظفر تشکیک کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی وجود کو اہمیت دیتے ہیں تو کبھی وجود کا انکار کر دیتے ہیں اور کبھی زندگی کو عذاب قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ کہاں عذاب جھیلنے آئے ہیں۔ وہ اقرار کریں یا انکار دونوں صورتوں میں وجود مرکز ہے۔ عذاب اسی وجود نے جھیلنے ہیں اور جوہر پر مقدم بھی، اسی وجود نے ہونا ہے۔

عذاب جھیلنے والے قدیم ہیں ہم تم

کہاں وجود ہیں ثابت، دو نیم ہیں ہم تم(37)

معاصر غزل گو قمر رضا شہزاد کو بھی وجودی مسائل در پیش ہیں ان کی شاعری بھی 'میں' کی شاعری ہے وہ انسانی وجود اور کائنات کی کھوج میں ہیں وہ شش جہات میں انسانی وجود کو تنہا پاتے ہیں۔ان کے نزدیک فرد کا وجود یہاں غیر محفوظ ہے اسے کئی طرح کی بلائیں گھیرے ہوئے ہیں۔ وجود ہی مرکز و محور ہے لیکن ظلم و ستم کی باڑیں اس کے گرد موجود ہیں ایک طرف دنیا کی سرد مہری ہے تو دوسری طرف مذہبی فلاسفہ کے مطابق پروردگار کا عتاب ہے اس سب کے بیچ فرد کا وجود تنہا ہے۔اپنے شعری مجموعے "پیاس بھرا مشکیزہ" میں اسی اضطراب کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

ابھی تو دنیا کی سرد مہری سے لڑ رہا ہوں

سلوکِ پروردگار بھی دیکھنا ہے اک دن(38)

وجودی فلاسفہ کی طرح قمر رضا شہزاد کے ہاں فرد کا وجود مرکزیت کا حامل ہے اور وہ اس قدر اہم ہے کہ اسی کی بدولت زندگی میں تحریک ہے وگرنہ جہانِ رنگ و بو میں کوئی چاشنی نہیں ہے۔بقول قمر رضا شہزاد:

میرے ہونے سے تھا زندگی میں تحرک یہاں

میں رکا تو اسی پل یہ سارا جہاں رک گیا(39)

وجود جوہر پر مقدم ہے اس لیے اسے بچانا زیادہ اہم ہے۔اگر زمین پر وجود کو خطرہ ہو تو قمر رضا شہزاد کہتے ہیں وجود کی حفاظت اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے زمین کو چھوڑ کر کسی دوسرے سیارے پر بھی منتقل ہوا جا سکتا ہے۔ وجودی فلاسفہ کے مطابق وجود ہے تو جوہر ہے۔وجود ہی کے ذریعے جوہر کا پتہ چلتا ہے اس لیے وجود کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔قمر رضا شہزاد وجود کی بقا کے لیے زمیں زادوں سے رخصت لے کر کسی دوسرے سیارے پر ٹھکانہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔

زمین زاد یہاں سے ہمیں روانہ کریں

ہم ایک دوسرے سیارے پر ٹھکانہ کریں(40)

وجودی فلاسفہ کے نزدیک انسان وہی کچھ ہے جو اس نے خود بنانا ہے۔ قمر رضا شہزاد ان کے اس نظریے سے متفق نظر آتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے خود کو خود بنانا ہے اور اپنی دنیا بھی خود تعمیر کرنی ہے۔ یہ سب انسانی وجود کے عمل سے مشروط ہے کوئی غیبی طاقت اس کے لیے کچھ نہیں کرے گی وہ اپنے عمل اور اپنے فیصلوں سے ہی اپنی زندگی جنت یا جہنم بنائے گا یہ اس پر ہے کہ وہ کیکر کی شاخ سے قلم بناتا ہے یا نیزہ بناتا ہے۔

اب خود ہی سوچتا ہوں کہ کیکر کی شاخ سے

یونہی قلم بنایا ہے نیزہ بنا تا میں

یوں تو دکھائی دیتے ہیں یہ سانس لیتے لوگ

ان میں کسی کو واقعی زندہ بنا تا میں (42)

ژاں پال سارتر جس عدم اور وجود کو زیر بحث لاتا ہے وہ بحث معاصر غزل گو شاعر اختر عثمان کی شاعری میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ عدم سے وجود میں آنا اور پھر وجود کو مرکزیت ملنا اور وجود کو جوہر پر مقدم قرار دینے کے مباحث سامنے آتے ہیں۔ اختر عثمان اپنے شعری مجموعے "کچھ بچا لائے ہیں" میں وجود کو لے کر کچھ ایسی ہی الجھنوں کا شکار ہیں۔ غیاب کو نظر سطحِ شہود پر لاتی ہے تو عدم سے وجود عطا ہوتا ہے یا چرخ پہ خمیر گردش کرتا ہے تو کوزہ وجود میں آتا ہے یا پھر وجود ملنے پر بھی وجود کی جگہ سایہ وجود میں آتا ہے یہ تمام سوالات اور مباحث اختر عثمان کے ہاں ملتے ہیں۔

وجود ملنے پہ بھی کیا وجود میں آیا

مری جگہ، مرا سایہ وجود میں آیا

بہ سطحِ چرخ بہت کی خمیر نے گردش

بڑے عذاب سے کوزہ وجود میں آیا

نظر غیاب کو سطحِ شہود پر لائی

جہاں میں جو بھی عدم تھا وجود میں آیا (42)

وجودی مفکرین اس سے بحث کرتے ہیں کہ فرد اپنے خارج میں ہے اور پھر وہ داخلی کائنات کی اہمیت بھی بیان کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ وجود کو مرکز و محور قرار دیتے ہیں اور اسے جوہر پر مقدم جانتے ہیں۔ خارج و باطن کی دلچسپ صورتِ حال اختر عثمان کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ بیرونِ بدن بھی حیرتیں ہیں اور باطن بھی حیرتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ رکھتا ہے۔ بیرونِ بدن اور درونِ بدن کی تحیر انگیزی اختر عثمان کے ہاں کچھ یوں سامنے آتی ہے:

خود سے نکلا تو عجب حال تھا بیرونِ بدن

حیرتیں ساتھ لیے خود میں در آیا ہوں میں (43)

انسان کہیں سے زمیں پر پھینکا گیا ہے۔ وہ یہاں بیگانگی اور مغائرت کا شکار ہے اور یہاں اس کو وجود محفوظ نہیں ہے وجودی فلاسفہ کے اس طرح کے مباحث کی جھلک اختر عثمان کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔

نہیں زمیں پہ کسی کا بھی اعتبار مجھے

کہا تھا کس نے کہ افلاک سے اتار مجھے

بہ چرخِ کوزہ گرِ دہر چیختا ہے کوئی

میں جیسے حال میں ہوں چاک سے اتار مجھے (44)

اسی طرح اختر عثمان کا یہ شعر سارتر کے اس بیانیے کی خوب صورت اور مکمل عکاسی کرتا ہے کہ ہم لوگ کہیں سے زمیں پر گرے ہیں۔ بقولِ اختر عثمان:

وجود نے بھی سہارا نہیں دیا اختر

ہم ایسے لوگ یہاں زینۂ عدم سے گرے (45)

اختر عثمان کے ہاں وجود کی تلاش بدستور جاری ہے بیگانگی کا احساس بھی موجود ہے اور وجود کی تکمیل کرنے کی جستجو بھی ہے۔ وہ اپنے وجود کی مٹی کی تلاش میں ہیں تاکہ اپنے وجود کی تکمیل کر سکیں۔

کسی بھی خطے میں پائی نہ اپنی بوئے خمیر

مرے وجود کی مٹی ہے کن تغاروں میں(46)

درج بالا مباحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں ایسے اشعار بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں وجود کی مرکزیت واہمیت اجاگر ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جوہر پر وجود مقدم ہے اور وجود کے تقاضے پہلے ہیں وجود ہے تو جوہر ہے وجود کی بقااور تکمیل از حد ضروری ہے کسی بھی جبر سے وجود کو نقصان پہنچانا صریحاً غلط ہے۔ فرد وہی کچھ ہے جو وہ خود کو بناتا ہے انسانی فطرت کوئی شے نہیں انسان نے خود اپنی تکمیل کرنی ہے۔

ج: اعلیٰ مقاصد کی جستجو

الحادی وجودی فلاسفہ میں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرد اپنے بارے میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آیا؟ کس مقصد کے لیے آیا ہے ؟اس نے کہاں جانا ہے اور بعد از مرگ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا؟ فرد کو صرف یہ معلوم ہے کہ اس نے اس دنیا میں رہنا ہے اور اپنی طبعی عمر پوری کرنی ہے۔ اب جب کہ اس نے اس دنیا میں رہنا ہے تو وہ اپنے ہونے کے جواز ڈھونڈتا ہے اور اپنے لیے کچھ مقاصد کا تعین کرتا ہے جس سے وہ اپنے فیصلوں، ارادوں اور عمل سے اپنے آپ کو بہتر بنا سکے اور انسانی معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکے۔ اگر صوفیانہ تعبیر یا الہیاتی تعبیر بھی کی جائے وجودیت کی تو بھی فرد اعلیٰ مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ مقاصد کا تعین اور انھیں اعلیٰ یا ادنیٰ انسان اپنے فہم کے مطابق قرار دیتا ہے۔ دونوں دبستانِ وجودیت کے نزدیک فرد کو اعلیٰ مقاصد کی جستجو کرنی چاہیے کہ یہ فرد کی آزادی کا بہترین پہلو ہے۔ فرد کی آزادی کے اختیار سے فرد کے وجود کو یہی فائدہ ہے کہ وہ اعلیٰ مقاصد کی جستجو کرے جس سے اپنی اور دوسروں کی زندگی کو آسان اور پر وقار بنا سکے۔ مذہبی تعبیر والوں کے نزدیک ان اعلیٰ مقاصد کا تعین کسی ذاتِ مقدس نے کیا ہے جو خالق کائنات ہے جب کہ الحادیوں کے نزدیک اعلیٰ مقاصد اور اخلاقی اقدار کا تعین فرد نے خود کرنا ہے۔ ہم یہاں معاصر غزل گو شعراء کے حوالے سے جانیں گے کہ ان کے ہاں اعلیٰ مقاصد کیا ہیں اور ان کی نوعیت کیا ہے۔ معاصر غزل گو شعراء میں میر احمد نوید ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں وجودیت کے کم و بیش سبھی پہلو کسی نہ کسی درجے پر مل جاتے ہیں۔ اعلیٰ مقاصد کی جستجو جسے ہم وجودیت کے ذیل میں فرد کی آزادی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ میر احمد نوید کے ہاں ان مقاصد کے حوالے سے خاصا مواد موجود ہے جہاں وہ اعلیٰ مقاصد کی جستجو بیان کرتے ہیں اور ان کی نوعیت کا تعین کرتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے

'وجود' کی ابتدائی غزلوں میں ایک مسلسل غزل ہے جس کی ردیف ہی 'مقصد' ہے اور اس مقصد کا مطالعہ وجودیت کے تناظر میں کرنا زیادہ معقول ہے۔

عمر بھر خاک چھانتا ہی رہا

در بہ در ڈھونڈتا رہا مقصد

رازِ ہستی ہے کس میں پوشیدہ

درد مقصد ہے یا دوا مقصد

مجھ پہ مقصد کھلا تو مجھ پہ کھلا

میرے اندر ہی ہے مرا مقصد

ہے ہر اک میں کے واسطے اک تو

ہے ہر اک میں کا اک جدا مقصد (47)

اس مسلسل غزل میں میر احمد نوید نے وہ سوالات اٹھائے ہیں جو مقصد تلاش کرنے والوں کے بنیادی سوالات ہیں۔ ہونا بے معنی ہے یا بامعنی اس پہ بھی مختلف آرا رکھنے والے دبستان موجود ہیں۔ ایک لغویت، لایعنیت اور لاشئیت کا قائل ہیں جب کہ دوسرے دبستان کے نزدیک اپنے ہونے کا جواز ہے تو ٹھیک ورنہ جواز پیدا کرنا ہو گا اور زندہ رہنے کے لیے مقاصد کا تعین کرنا ہو گا چنانچہ میر احمد نوید مقاصد تلاش کرتے ہیں اور در بہ در مقصد کی تلاش میں بھٹکتے ہیں وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ رازِ ہستی کس میں پوشیدہ ہے کیا درد مقصد ہے یا دوا مقصد ہے؟ بہت غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر اپنے وجود کے اندر جھانکوں تو میرے اندر ہی میرا مقصد پوشیدہ ہے جسے مجھے تلاش کرنا ہو گا۔

وجودیت کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ وجود کے تقاضے پورے کیے جائیں فرد کو آزادی حاصل ہو تا کہ وہ اپنے وجود کی تکمیل کر سکے خود کو تعمیر کر سکے اسی دوران میں کچھ مقاصد بھی نمودار ہوتے ہیں جن کے حصول کے ذریعے فرد اپنی اور اپنے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ خود کو بدلنا اور اپنے جیسوں کی زندگی کو بدلنا اور اسے بہتر بنانا اپنی جگہ ایک عظیم مقصد

ہو سکتا ہے کیوں کہ وجودی سمجھتے ہیں کہ انسان وہی کچھ ہے جو وہ خود کو بناتا ہے۔اس ضمن میں میر احمد نوید کے اشعار اہمیت کے حامل ہیں جہاں وہ لمحہ لمحہ بدلنے کی بات کرتے ہیں نہ صرف خود کو بلکہ پورے جہاں کو:

لہو بدلتے ہوئے استخواں بدلتے ہوئے

یہ عمر کٹ ہی گئی جسم و جاں بدلتے ہوئے

کوئی بتاؤ ہمیں یہ جہاں بھی کچھ بدلا

کہ خود بدل گئے ہم یہ جہاں بدلتے ہوئے(48)

ظلمتِ کدہ دہر میں اپنے حصے کی شمع جلانا، دوسروں کو راہ دکھانا اور انسانیت کی مدد کرنا اپنی جگہ ایک بلند مقصد ہے۔فرد اپنے وجود کی تعمیر و تشکیل میں اس مرحلے سے بھی گزرتا ہے جہاں وہ اہلِ جہاں کے لیے بھی فکر مند ہوتا ہے اور ان کی مدد کا جذبہ اس کے دل میں موجزن ہوتا ہے ایسے میں وہ اپنا نفع نقصان دیکھے بغیر ان کی مدد کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنا نصب العین بنالیتا ہے۔میر احمد نوید کی غزل کا درج ذیل مقطع ایسے ہی خیالات کی وضاحت کر رہا ہے۔

دنیا میں اپنے ہونے کا کوئی تو چراغ جلا جاؤں

یعنی میں جینے مرنے کو مفہوم نیا پہنا جاؤں(49)

بالکل ایسے ہی خیالات کی جھلک ان کی ایک اور غزل میں دکھائی دیتی ہے جس کا مطلع کچھ یوں ہے:

پوچھتے کیا ہو کہ کیا چاہیے ہے

مجھ کو دنیا کا بھلا چاہیے ہے(50)

مسلسل حرکت و عمل اور سعیِ پیہم بھی بڑے مقاصد میں سے ایک ہیں فرد مکمل ہو نہ ہو لیکن اس میں تکمیل کی جستجو ہر لمحہ رہتی ہے وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے اور خود کو بہتر کرنا چاہتا ہے گویا خوب سے خوب تر کی جستجو کا عمل ساری زندگی جاری رہتا ہے۔بقول میر احمد نوید:

کہاں ہم اور کہاں رکنا ٹھہرنا

ہوئے ہیں سعیِ پیہم سے مکمل

ہر اک لمحہ ہیں ہم جاری و ساری

نہ آدم سے نہ خاتم سے مکمل(51)

معاصر غزل گو شاعر صابر ظفر کے ہاں کسی بڑے مقصد کے لیے لڑنا اور جان دینا از خود ایک عظیم مقصد ہے۔ صابر ظفر کی شاعری مزاحمتی شاعری ہے ان کے نزدیک ظلم کو ختم کرنے کے لیے اور اپنے حق کے حصول کے لیے ڈٹ جانا بڑا مقصد ہے۔ وہ اپنا اور اپنے جیسوں کا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں:

عدو کے سامنے شمشیر سا علم ہو کر

محاذِ عشق پہ آیا ہوں تازہ دم ہو کر

ظفر شہیدوں کے جذبے کبھی نہیں مرتے

لہو سے فتح کو لکھتے ہیں سر قلم ہو کر(52)

کامران نفیس صابر ظفر کو حساس شاعر قرار دیتے ہیں جو سامراجی ظلم و استبداد کے خلاف شعری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ بقولِ کامران نفیس:

"ایک تو پانی جیسا عنصر جسے صابر ظفر نے الگ الگ انداز میں کہیں علامت، کہیں استعارہ تو کہیں زندگی کی بنیادی ضرورت و اکائی کے طور پر پیش کیا اور دوسرا سامراجی ظلم و استبداد کے خلاف اپنی شعری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے ایک حساس شاعر ہونے کا ثبوت بھی پیش کیا۔"(53)

صابر ظفر کے ہاں اہلِ زمیں کا سر اٹھانا بھی اہلِ زمیں کے بڑے مقاصد میں شمار ہوتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جب زمیں والے سر اٹھائیں گے تو آسماں خود ہی جھکنا شروع ہو جائے گا:

ظفر اہلِ زمیں جب سر اٹھائیں گے

جھکیں گے آسماں آہستہ آہستہ (54)

صابر ظفر سمجھتے ہیں کہ بڑے مقصد کے حصول کے لیے قربانی کی ضرورت ہے اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے قربانی کا جذبہ رکھنا اور قربانی دینا از خود ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ صابر ظفر کبھی لہو سے چراغ جلانا چاہتے ہیں اور کبھی لہو سے پیڑ اگانا چاہتے ہیں کہ بھولے بھٹکوں کو راہ ملے اور بے گھر پرندوں کو ٹھکانا ملے:

جل اٹھیں اگر چراغ میرے

ممکن ہے کہ ڈھونڈ لیں سویرے

جب اپنے لہو سے پیڑ اگیں گے

چڑیوں کو ملیں گے تب بسیرے (55)

صابر ظفر کے نزدیک وطن کے لیے جینے مرنے کا جذبہ ایک عظیم جذبہ ہے اور وہ اس اعلیٰ مقصد کی جستجو میں ہیں:

تمھی منزلِ حق کے راہی، ہے یہ گل زمیں کی گواہی

وطن کے لیے جینے مرنے کا ہر راستہ سامنے ہے (56)

صابر ظفر اپنی زندگی آپ جینے کی ٹھان چکے ہیں اور یہی ان کی زندگی کا مقصد ہے کہ وہ موت کے مقابل ڈٹے رہیں گے اور بھرپور طریقے سے اپنی زندگی جئیں گے۔

چاہے ہو ظفر اجل مقابل

ہم اپنی ہی زندگی جئیں گے (57)

جہدِ مسلسل، عشق، شوقِ شہادت، مزاحمت، دشمنوں سے مقابلہ اور ظالموں کا خاتمہ صابر ظفر کے بنیادی اور اعلیٰ مقاصد میں سے ایک ہیں۔ وہ مزاحمت کا راستہ اپناتے ہیں اور فرد کی آزادی کے لیے جستجو کرتے ہیں، عشق کا جذبہ ان میں موجزن ہے جو انھیں جہدِ مسلسل پر اکسائے ہوئے ہے اور وہ شوقِ شہادت کی صدا سنتے سر دھنتے ہوئے رواں دواں ہیں۔

ظفر یہ جہدِ مسلسل ہے عشق ہی کی عطا

صدائے شوقِ شہادت، لہو کا دوست لہو(58)

معاصر غزل گو قمر رضا شہزاد کی شاعری میں اعلیٰ مقاصد کی جستجو کی جھلک دکھائی دیتی ہے ان کا جذبہ اس قدر اعلیٰ و ارفع ہے کہ وہ دوسروں کو راستہ دینے کے لیے خود کو رستے سے ہٹانے کا عزم رکھتے ہیں۔

خود کو رستے سے ہٹا دیتا ہوں

آنے والوں کو جگہ دیتا ہوں(59)

قمر رضا شہزاد کے ہاں ہمدردی، انسانیت اور محبت کے جذبات ملتے ہیں۔ یہاں سارتر کے نظریات کی مزید توسیع ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ سارتر جب کہتا ہے کہ فرد آزاد ہے اور وہ انسان دوست ہے اسے اپنے فیصلوں اور اعمال کی ذمہ داری اٹھانی ہے اور دوسروں کا خیال رکھتے ہوئے فیصلے کرنے ہیں تو یہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ محبت اور ہمدردی کے جذبات ہی وہ طاقت ہیں جو فرد کی آزادی کو بے لگامی کی حد تک نہیں جانے دیتے وہ دوسروں کا بھی خیال رکھتا ہے اور اپنی آزادی کا بھرم بھی رکھتا ہے۔ بقول قمر رضا شہزاد:

مرے علاوہ بھی آئیں گے سر پھرے افراد

میں دوسروں کے لیے ایک راہ کر آیا

تمام نیکیاں لوگوں میں بانٹ دیں شہزاد

میں اپنے صفحے کو خود ہی سیاہ کر آیا(60)

بقول ڈاکٹر وحید احمد:

"قمر رضا شہزاد کی شاعری میں اکثر روشنی کے حوالے ملتے ہیں وہ جگمگاتی سوچ کا شاعر ہے۔ جہاں اسے روشنی نظر آتی ہے تعاقب کرتا ہے وہ روشنی جو انبیا اور آئمہ کو مرکز و محور تھی۔ وہ روشنی جو سقراط اور جون آف آرک کے گرد ہیولا کرتی تھی وہ روشنی جو اساتذہ کے دواوین میں رواں ہے اور وہ روشنی جو قمر رضا شہزاد کے چقماق کے خمیر میں ہے وہ کبھی روشنی کا جشن مناتا ہے تو کبھی تاریکی کی عزاداری کرتا ہے۔ جب اس کے

چراغ کی لو کو تلوار سے بجھایا جاتا ہے تو وہ کبھی چاندنی کشید کرتا ہے اور کبھی شبِ دیجور کا گریہ اٹھاتا ہے۔"(61)

دوسروں کے لیے راہ بنانااور اپنی نیکیاں اوروں میں بانٹناانسانیت کی خدمت ہےاور انسانیت کی خدمت سے بڑھ کر انسان کا اعلیٰ مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ قمر رضا شہزاد کے ہاں ایسے ہی مقاصد کی بازگشت سنائی دیتی ہے جہاں وہ محبت اور ہمدردی کی دولت کو لوگوں میں بانٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

جی بھر کے بانٹتا ہوں محبت خدا کا شکر

میں نے تجوریوں میں یہ دولت نہیں بھری(62)

قمر رضا شہزاد کے ہاں اپنی مثبت انااور خودی کا تحفظ بھی ایک اعلیٰ مقصد ہے۔وہ کسی قیمت پر اپنی خودداری اور راست گوئی کا سودا نہیں کر سکتے۔ وہ سیاہ کو سفید ماننے اور لکھنے پر تیار نہیں وہ اپنے کچھ ہم عصروں کو اس لیے بھی اچھا خیال نہیں کرتے کہ وہ دربار کے ایک بلاوے پر دوڑے چلے جاتے ہیں اور اہلِ دربار میں جگہ پانے کے لیے کاسہ درازی تک اتر آتے ہیں۔ قمر رضا شہزاد کے ہاں خودداری یا مثبت انا بڑی شے ہے کسی حاکم یا ظالم کے بلاوے پر دوڑے چلے جانے کو وہ ناپسند کرتے ہیں:

ایک بلاوہ کیا آیا دربار سے بس پھر

اپنا آپ کسی نے بھی نایاب نہ رکھا(63)

معاصر غزل گو شاعر اختر عثمان کے نزدیک انسان اعلیٰ وارفع مقام رکھتا ہے اور وہ یہ مقام اپنے فیصلوں اور ارادوں سے حاصل کرتا ہے ان کے نزدیک اعلیٰ مقاصد کی جستجو انسانی وقار میں اضافے کا باعث ہے۔ وہ فرد کو مرکز و محور سمجھتے ہیں ان کے خیال میں اہلِ زمیں آسماں پہ فوقیت رکھتے ہیں جبھی تو آسماں زمین زادوں سے دشمنی مول لیتا ہے۔ وہ چھا جانا چاہتے ہیں۔ کائنات کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں اور فرد کی مرکزیت ثابت کرنا چاہتے ہیں:

ابھی تو پر بھی نہیں تولتا اڑان کو میں

بلاجواز کھٹکتا ہوں آسمان کو میں

یہ کائنات مرے سامنے ہے مثلِ بساط

کہیں جنون میں الٹ دوں نہ اس جہان کو میں (64)

اختر عثمان لوٗ کو صبا میں بدلنے کے دعوے دار ہیں۔ لو کو صبا میں بدلنا بھی اپنی نوعیت کا کارنامہ ہے اسے ان کا اعلیٰ مقصد سمجھ لیجیے کہ جس قدر دشوار زندگی ملی اسی قدر جوش اور ولولے سے اسے جینے کی ٹھان بیٹھے ہیں تھل سے گزرنا ان کا نصیب ہے، مجبوری ہے لیکن یہ ان کا یہ عزم ہے کہ تھل سے گزرتے ہوئے اپنے جذبے اور اپنی کاری گری سے لو کو صبا میں بدلتے جاتے ہیں۔

مرا کمال کہ لو کو صبا کیا میں نے

مرا نصیب کہ ہر بار تھل سے گزرا ہوں (65)

اپنے عزم، حوصلے اور جذبے کی پختگی کا اظہار اختر عثمان نے بارہا کیا ہے۔ وہ جہانوں کی سیر کرنے کے خواہاں ہیں اور ایک ہی جست میں افق آفاق پار کرنے کے خواہش مند ہیں۔ چھا جانے کی خواہش اور تمنا فرد کے اندر بیدار رہتی ہے۔ اختر عثمان نے اسے خوب ہوا دی اور اسے اپنے مقاصد میں شامل کر لیا۔

اڑنا ہے مجھے اور جہانوں کے لیے بھی

امکان ہیں کچھ اور بھی جذبوں کی ہوا میں

اک جست کی منزل پہ ہیں پھیلے ہوئے آفاق

اک اور قدم تک ہے زمانہ سرِ پا میں (66)

اور پھر "کچھ بچا لائے ہیں" کا یہ شعر:

یہ آب و تاب تو مجھ میں ازل ہی سے تھی اختر

مرے تیور بتاتے تھے ستارہ کیا بنے گا (67)

اختر عثمان کے ہاں ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ غالب ہے وہ خود دکھ درد سہہ کر دوسروں کو آفات و تکالیف سے بچانا چاہتے ہیں کس قدر اعلیٰ جذبہ ہے کہ وہ دوسرے کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ فرد کی آزادی کے تصور کو وسعت عطا کریں تو دوسرے انسانوں کا خیال رکھنا اور خود دکھ سہنا انسان کے وقار کے مطابق ہے اور اس کی آزادی کے اختیار کو عزت بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر غزل گو شعراء ہمدردی اور انسان دوستی کی مثال بنے ہوئے ہیں۔ بقولِ اختر عثمان:

شکن شکن جو مری روح میں بچھا ہے یہ درد

خدا نہ کردہ! ادھر سے ادھر چلا جاتا(68)

فرد زمین پہ رہتے ہوئے اپنی تعمیر و تشکیل میں ایسے مراحل سے گزرتا ہے کہ جہاں وہ اعلیٰ مقاصد کی جستجو کرتا ہے۔ جس سے اپنے ظاہری اور باطنی وجود کو سنوار سکے، حقیقت کی کھوج میں نکلے اور دوسروں کے لیے آسانی پیدا کرے۔ درج بالا بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں اعلیٰ مقاصد کی جستجو موجود ہے۔ یہ اعلیٰ مقاصد ظلم کے خلاف ڈٹ جانے کے بھی ہیں، محبت کے پھیلانے اور دوسروں کے کام آنے کے بھی ہیں، کائنات تسخیر کرنے اور حقیقت کی تلاش کے بھی ہیں۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرد اپنی تکمیل کے لیے اعلیٰ مقاصد کا تعین کرتا ہے اور پھر ان کی جستجو میں نکل جاتا ہے۔

د: فرد کی آزادی اور مزاحمت

مزاحمت کے معنی روک ٹوک یا رکاوٹ ڈالنے کے ہیں۔ یعنی اداروں اور ریاست کے ایسے فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دینا اور احتجاج کرنا جو انسان کو مالی، معاشی یا ذاتی معاملات میں نقصان پہنچا رہا ہو یا جو فیصلہ انسانی آزادی کے لیے نقصان دہ ہو۔ گزشتہ ابواب میں ہم فرد کی آزادی اور آزادی کی اہمیت پر تفصیلی بات کر چکے ہیں۔ یہاں ہم اس پر بحث کریں گے کہ اگر کسی نہ کسی ذریعے سے انسانی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کی جائے تو فرد کے پاس کون سے راستے ہوتے ہیں جن پر چل کر وہ آزادی کے حصول کو ممکن بنا سکتا ہے؟ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ فرد اپنی آزادی کے حقوق حاصل کرنے کے لیے مزاحمتی روپ دھارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مزاحمت ہی وہ راستہ ہے جو فرد کی آزادی کا زینہ بن سکتا ہے۔ معاصر اردو غزل گو شعراء کے کلام کا مزاحمت کے تناظر میں مطالعہ کرنے سے پہلے ہم ان حالات پر بات کرتے ہیں

کہ جن کے سبب مزاحمت جنم لیتی ہے یا یوں کہیے کہ وہ کون سے حالات ہیں جو فرد کو مزاحمت کے لیے اکساتے ہیں؟اس سلسلہ میں ہم البرٹ کامیو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔الجیرین مفکر البرٹ کامیو نے اپنی ایک تقریر میں اپنی قوم کے کچھ ایسے حالات وواقعات کا ذکر کیا کہ جس سے وہ لوگ مزاحمت پر مجبور ہونے لگے۔کامیو البرٹ کہتا ہے:

"ہم جنگِ عظیم اول کے اوائل میں پیدا ہوئے۔عہدِ شباب میں ہمیں ۱۹۲۹ کی بے چینی اور بیس برس کی عمر میں ہٹلر کے بحران سے گزرنا پڑا، پھر ایتھوپیا کی جنگ اور اندلس و میونخ کی خانہ جنگی نے آن لیا، بعد ازاں جنگِ عظیم دوم اور اس کی شکست کے بعد ہٹلر ہمارے شہروں اور گھروں میں گھس آیا، ایسی دنیا میں رہتے ہوئے ہم کس پر اعتبار کرتے؟ سوائے انکار کے یا انکارِ ذات کے؟ ہر شے ہمارے لیے ناقابل برداشت تھی سو ہم نے مزاحمت کی۔"(69)

البرٹ کامیو کے بیان کردہ حالات وواقعات کی طرح اگر ہم اپنے ملک کے حالات وواقعات کا سرسری جائزہ لیں تو یہ سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جائے گی کہ ہمارے ہاں مزاحمت کی نوبت کیسے آئی۔ہمارے حالات البرٹ کامیو کے بیان کردہ حالات سے زیادہ مختلف نہیں اگر بغور دیکھا جائے تو ان حالات سے بھی زیادہ سنگین معلوم ہوں گے۔ایک تو تقسیمِ ہند کا غیر معمولی واقعہ جس نے انسانیت کے پرخچے اڑا دیے، بے تحاشا نقصان اٹھانے کے باوجود یہ امید تھی کہ قیامِ پاکستان کے بعد حالات بہتر ہوں گے لیکن ہوا یہ کہ پڑوسی ملک سے دشمنی پالنا پڑ گئی۔۱۹۴۸، ۱۹۶۵، ۱۹۷۱ اور کارگل کی جنگیں لڑیں۔ افغان جنگ کا حصہ بننا، ملک میں دہشت گردی، ڈرون حملے، خودکش حملے اور بچوں کے قتلِ عام جیسے واقعات نے انسان کو انتہائی غیر محفوظ کر دیا۔ دوسری طرف آمریت کے ملک میں ڈیرے، آزادیِ اظہار پر پابندی، جمہوری اقدار کی پامالی، معیشت کی بدحالی، کارپوریٹ سیکٹر کی اجارہ داری، سرمایہ داری کا راج، جاگیرداری نظام اور چند خاندانوں کے ہاتھوں میں کارِ سلطنت نے عوام الناس کو اس قدر مجبور کر دیا کہ وہ مزاحمت کی راہ اپنا لیں چنانچہ یہی ہوا، بیرونی قرضے اور دوسرے ممالک کا حکم بھی ایک بڑی وجہ رہے۔شعراء اور ادبا تو تقسیمِ ہند سے قبل ہی ترقی پسند تحریک کا حصہ بن کر سراپا احتجاج تھے۔یہ وہ پہلی تحریک تھی جس میں وجودیت کے نقوش ابھر رہے تھے۔آگے چل کر شعراء نے بھرپور مزاحمتی روپ دھارا، فیض، جالب اور فراز جیسے نام سامنے آئے۔معاصر اردو غزل گو شعراء بھی فرد کی آزادی کے تناظر میں بھرپور مزاحمت کرتے آرہے ہیں۔منتخب معاصر شعراء کے ہاں مزاحمت کے عناصر کا یہاں تجزیہ کیا جاتا ہے۔

معاصر غزل گو میر احمد نوید کا کلام وجود کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ان کے ہاں وجودیت اور فرد کی آزادی کے دیگر پہلوؤں کی طرح مزاحمت کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔درج بالا بحث کے تناظر میں ان کا یہ شعر اہمیت کا حامل ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے حالات مزاحمت کے لیے موزوں ہوتے ہیں:

اگر ہوں جیب و گریبان و دامن و دل چاک

کہاں کہاں سے یہ وحشت بھلا چھپائے کوئی(70)

معاصر غزل گو شعراء کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے عہد میں صاحبِ اختیار ان پہ کرم کے نام پہ ستم کرتے ہیں۔ تلواریں بے نیام کر کے نکل آنا اور ہے اور بظاہر فرد کی بھلائی کے اقدامات کے پیچھے اپنے ذاتی مفادات کا چھپا ہونا اور ہے۔اس عہد میں دوسرا مسئلہ در پیش ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ آپ پہ کرم کیا جا رہا ہے لیکن پسِ پردہ نقصان کیا جا رہا ہوتا ہے۔ نام نہاد جمہوریت اور کارپوریٹ سیکٹرز اس قسم کے ستم کرنے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔میر احمد نوید اس باب میں کہتے ہیں:

ہے کون سا کہ جو ہم پر ستم کیا نہ گیا

ستم! جو ہم پہ بہ نام کرم کیا نہ گیا(71)

اسی کرم نما ستم کی تصویر کشی وہ دوسری جگہ کچھ یوں کرتے ہیں:

یوں بھی زنجیر سی اک گردِ قدم ہے ہر دم

کیا ہوا اگر کوئی پابندِ سلاسل نہ ہوا(72)

میر احمد نوید کے شعری مجموعے "ہاں اور نہیں کے درمیاں" میں موجود ایک مسلسل غزل مزاحمت کی بھرپور علامت ہے۔ یہ ایک غزل ہی ان کے مزاحمتی شعور کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ جہاں وہ اسلحے سے پاک، سرحدوں کی اجارہ داری سے دور نام نہاد فوق البشر سے خالی زمین پر فلک دنیا چاہتے ہیں:

مکر کی دنیا نہ یہ چالاک دنیا چاہیے

ہم کو تو بس اسلحے سے پاک دنیا چاہیے

ختم کر دو سر حدوں کی یہ اجارہ داریاں

ہر بشر کی مشترک املاک دنیا چاہیے

ہم نہیں وہ جو بہل جائیں گے جنت سے نوید

اس زمیں پر ہی ہمیں افلاک دنیا چاہیے (73)

میر احمد نوید کسی کی کار سازی اور چارہ سازی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان چارہ سازوں نے چارہ سازی کے نام پر درد کو بدنام کیا ہے۔ کبھی مذہب تو کبھی وطن کے نام پہ لوٹا ہے۔ مذہبیت اور وطنیت دو موثر ہتھیار رہے ہیں جن سے غریبِ شہر کو بارہا لوٹا گیا۔ عوام بھی بڑے سادہ تھے ہر بار ان کی چال میں آگئے اور اپنا نقصان کر بیٹھے۔ صرف وطن اور مذہب تک یہ سلسلہ محدود نہیں ہے بلکہ شاطر طبقہ ہر عہد میں بھولے اور سادہ لوگوں کی ذہنیت کو اپنے تراشیدہ نظریات سے متاثر کرتا آیا ہے۔ مذہب نے مجبوروں کو صبر کی تلقین کی اور وطن کے نام پر لوٹنے والوں نے اسے مٹی کی محبت کا قرض قرار دیا اور دونوں صورتوں میں اپنے ذاتی مفادات کے لیے مظلوموں کا استحصال کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب میر احمد نوید چارہ سازوں کے اصل چہرے سے واقف ہو چکے ہیں۔

یہاں نہ دخل دے، رکھے وہ اپنے کام سے کام

جسے ہو دعویٰ یہاں کارساز ہونے کا (74)

معاصر غزل گو شاعر صابر ظفر کا کلام مزاحمت سے بھرپور ہے۔ باقی شعراء کے ہاں مزاحمت ڈھونڈنے سے ملتی ہے جب کہ صابر ظفر کے ہاں مزاحمت کے علاوہ دیگر موضوعات کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ وہ ایک بھرپور مزاحمتی شاعر ہیں۔ مزاحمت ان کے خمیر میں شامل ہے۔ کامران نفیس لکھتے ہیں:

> "ظلم و جبر، معاشرتی ناہمواریاں، طاقتور اور کمزور کی جنگ اور سامراجی قوتوں کے جبر، ایک حساس شاعر اس کو کس انداز میں دیکھتا ہے۔ صابر ظفر اسے خوب جانتے ہیں، کہیں ریاستی ظلم و زیادتی پر آواز اٹھائی گئی ہے تو کہیں قبیح قبائلی رسومات کے نام پر ہونے والے ظلم پر۔" (75)

صابر ظفر کے اوپر تلے چوالیس شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ سبھی میں کسی نہ کسی درجے کی مزاحمت کا رنگ موجود ہے۔ جس وقت یہ مقالہ تحریر کیا جارہا ہے اس وقت بھی زود گو شاعر کا نیا شعری مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ یقیناً وہ بھی مزاحمتی رنگ میں رنگا ہوا ہوگا۔ آخر اس قدر جارحیت اور مزاحمت کی وجہ کیا ہے؟ یقیناً ان کے گرد وپیش کے حالات ہیں اور دوسرا ان کا ذاتی رجحان، مزاج اور میلان ہے جس سے مزاحمت چھلکتی ہے۔ انھیں سب سے زیادہ مسئلہ طاقت ور اداروں سے ہے جو اپنی حاکمیت قائم رکھنے کے لیے ظلم کے سلسلے دراز کیے ہوئے ہیں۔ وہ ادارے اپنے خلاف بولنے والوں کو مار دیتے ہیں یا اٹھا لیتے ہیں اور لا پتہ افراد کی فہرست میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بعض کو بعد از اغوا مار دیا جاتا ہے۔

انھیں روتا ہوں جو مارے گئے بعد از اغوا

اور حسین ابنِ علی کا بھی میں غم رکھتا ہوں (76)

صابر ظفر کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے ہی پاسبانوں سے ہے اور وہ مزاحمت بھی سبھی سے زیادہ انھی کی کرتے ہیں۔ محافظوں اور پاسبانوں نے اپنے ہی گھروں میں محصور کر رکھا ہے۔ صابر ظفر کا یہ دکھ بڑا دکھ ہے کہ جنھیں آزادی کی حفاظت کے لیے رکھا تھا وہی آزادی سلب کر بیٹھے۔ وہی غاصب بن گئے جنھوں نے غاصبوں سے بچانا تھا۔

محاذِ دل پہ محافظ نہیں درندے ہیں

کہا گیا کہ ہیں یہ سولجر لگائے ہوئے (77)

اسی موضوع کو انھوں نے تواتر سے دہرایا ہے کم و بیش ہر شعری مجموعے میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جہاں پاسبانوں کی پاسبانی کے خلاف واضح یا چھپا ہوا اشارہ موجود ہو۔ اپنے شعری مجموعے "روحِ قدیم کی قسم" میں اس موضوع کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

باہر تو نکل کے گھر سے دیکھو

تم لوگ ہو پاسباں کے قیدی

کانٹوں سے الجھ کے مر رہے ہیں

ہم اپنے ہی گل ستاں کے قیدی (78)

صابر ظفر کے ہاں پوری پوری غزلیں مزاحمتی رنگ میں مل جاتی ہیں۔ جہاں وہ ڈٹے رہنے کا، سرکش بنے رہنے کا، بساط الٹنے کا، یلغار کرنے کا اور ظلم کی رو کو پلٹنے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ اپنے ہی قبیلے کے شعراء کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ جو مصلحت کو اپنا رہے ہوں اور اس ڈر سے خاموش ہوں کہ کہیں زباں نہ کٹ جائے ایسے شعراء کو صابر ظفر بے ضمیر کہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی مظلوم کے ڈٹ جانے تک حق نہیں مل سکتا۔ سایہ شب کو گھٹانے کے لیے دیے کی لو تیز رکھنی ہوتی ہے۔

سرکش ہو، سخن کو سخت رکھو

لہجے کا وقار گھٹ نہ جائے

چلتے رہو چال سرکشی کی

جب تک وہ بساط الٹ نہ جائے

یلغار کرو کہ راستے سے

جب تک وہ غنیم ہٹ نہ جائے

ہر ظلم پہ بے ضمیر شاعر

چپ ہیں کہ زبان کٹ نہ جائے

ملتا نہیں حق ظفر کسی طور

مظلوم کوئی جو ڈٹ نہ جائے(79)

صابر ظفر سمجھتے ہیں زخموں کو آزادی ہی بھر سکتی ہے اور آزادی خود چھیننا پڑتی ہے۔ اس کے لیے صفیں چیرتے ہوئے گھروں سے نکلنا ضروری ہے۔

تمھارے زخم بھرے گی تمھاری آزادی

وگرنہ یوں ہی رہے گی لہو بھری وادی

جو گھر سے نکلو، صفیں چیرتے ہوئے نکلو

تمھارے پاؤں میں زنجیر کس نے پہنادی(80)

وہ ہر ایک ظلم کے خلاف سینہ سپر کیے ہوئے ہیں۔ ستم گر کی حکمرانی انھیں کسی طور قبول نہیں ہے۔

ہم اہلِ عشق کو چلنا ہے سر اٹھا کے وہاں

جہاں ہر ایک ستم گر کی حکمرانی ہے(81)

"آتشِ بیگانگی" میں کہتے ہیں:

وہی کہ آپ جسے پاسباں سمجھتے ہیں

وہ راستے سے ہٹے گا تو راستہ ملے گا

مزاحمت کے لیے جاں نثار کم تو نہیں

اگر نہ ایک ملے گا تو دوسرا ملے گا(82)

معاصر غزل گو قمر رضا شہزاد کے ہاں بھی مزاحمتی عناصر موجود ہیں وہ بھی کارپوریٹ سیکٹر اور خاص کر اسلحہ بردار طبقے کے خلاف طاقت کے غیر ضروری استعمال سے متعلق سراپا احتجاج ہیں۔ وہ ایسے تمام عناصر کی مخالفت کرتے ہیں جو فرد کے وجود کو نقصان پہنچائے یا اس کی آزادی کو سلب کرے۔ اپنے شعری مجموعے "شش جہات" میں اسلحہ سازوں کی سرزنش کرتے ہیں۔

نشانہ سب کو یہاں موت کا بناتے ہوئے

خدا کا خوف کرو اسلحہ بناتے ہوئے

سبھی کے پاؤں تلے بچھ گیا ہے میرا وجود

میں راستے میں ڈھلا راستہ بناتے ہوئے(83)

قمر رضا شہزاد دلوں سے موت کا خوف نکال کر خنجر تلے آنے کا عزم رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ زندہ رہنا ہے تو چٹان حوصلہ چاہیے:

مرنے کا خوف دل کی تہوں سے نکال دے

جینے کی آرزو ہے تو خنجر تلے سے آ(84)

بقول شازیہ رباب:

"وہ جو دکھانا چاہتے ہیں اسے دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مٹی میں آگ کا عنصر پانی سے زیادہ ہے۔ تبھی تو مزاحمت اور بغاوت ان کی شریانوں میں خون کے ساتھ گردش کرتی ہے۔"(85)

قمر رضا شہزاد ظالموں کے خلاف اپنی تلوار تیز کیے ہوئے ہیں بس اس انتظار میں ہیں کہ جنگ کا لمحہ آئے:

مت سمجھو کہ تلوار مری زنگ زدہ ہے

بس یہ کہ ابھی جنگ کا لمحہ نہیں آیا(86)

ان کے خون میں آگ دہک رہی ہے وہ پھول چھوڑ کے تلوار کی طرف آنے پہ مجبور ہیں:

کوئی تو آگ مرے خون میں دہکتی ہے

میں پھول چھوڑ کے تلوار کی طرف آیا(87)

قمر رضا شہزاد ظلم کر کے عزت کمانے والوں کی توقیر کرنے کے قطعاً قائل نہیں ہیں:

حیرت ہے کہ جو ظلم سے تقدیر بنائیں

کچھ لوگ انھیں صاحبِ توقیر بنائیں(88)

معاصر غزل گو شاعر اختر عثمان کے ہاں شعریت زیادہ اور مزاحمت کم ہے لیکن تلاش کرنے سے ایسے اشعار ضرور مل جاتے ہیں جن میں مزاحمتی عناصر موجود ہوں۔ طبعِ شاعر میں ٹکرانے اور زمانے کے چلن کے خلاف چلنے کی خو کچھ زیادہ

ہی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اختر عثمان بھی ظلم و جبر کے نظام کے خلاف اپنے دیے کی لو تیز کرتے ہیں اور ہوا کی مخالفت کی چنداں فکر نہیں کرتے۔

مرے چراغ کی لو کا سفر ہوا کے خلاف

مرے جنوں نے نیا راستہ بنایا ہے(89)

چراغ کا استعارہ اختر عثمان متعدد بار متعدد معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یہاں عام روش سے ہٹ کے ذرا مختلف معنوں میں چراغ کو برتا گیا ہے۔ جہاں خفیف سا مزاحمتی عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔

کئی چراغ نہیں جانتے کہ شب زادی

انھی کمینوں کے احساس کی جنی ہوئی ہے(90)

اپنے شعری مجموعے "ابدتاب" میں اختر عثمان ظلم و ستم کے خلاف اپنے ڈٹے رہنے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

زحمت کشِ زنجیر کوئی اور نہیں تھا

یہ سلسلہ کھینچا ہے ہمارے ہی گلو نے(91)

اہلِ کربلا مزاحمت کا استعارہ سمجھے جاتے ہیں۔ کربلا وہ واقعہ ہے جس نے پورے عالمِ اسلام کو مزاحمت سکھائی۔ اختر عثمان کربلائی فکر کے حامی ہیں ایک یہ وجہ بھی ان کو مزاحمت پر اکساتی ہے۔ جہاں راہ دشوار ہو اس طرف ہو جانا ہی حسینیت ہے۔ اختر عثمان ان لوگوں سے نالاں ہیں جو اسوہِ شبیر کا چرچا بھی کرتے ہیں اور دربار میں بھی کاسہ تھامے پہنچ جاتے ہیں۔

کہتے ہو کہ ہو اسوہِ شبیر پہ قائم

دربار میں کیوں جاتے ہو سر کیوں نہیں جاتا؟(92)

اردو غزل میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء میں اولیں شعراء ہیں جنھیں وجودیت کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اختر عثمان بھی خود کو ترقی پسندانہ رویوں اور سوچ کا شاعر کہتے ہیں۔ بقول حسین محمود:

"وہ خود کو ترقی پسندانہ سوچ کے حامل اور میر و بیدل کی روایت میں شعر کہنے والے کہتے ہیں اور غزل میں الگ جادہ تراشنے کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔"(93)

اختر عثمان اپنے شعری مجموعے "چراغ زار" میں جارحانہ انداز اپناتے ہوئے ظالموں اور جابروں کو بڑی شدت سے للکارتے ہیں اور انھیں آئینہ دکھاتے ہیں۔

جبر کی کوئی نہایت نہیں چھوڑی تم نے

ایک شے حسبِ ہدایت نہیں چھوڑی تم نے

واہ، کیا پاس تمھیں نسبتِ اجداد کا ہے

گھر جلانے کی روایت نہیں چھوڑی تم نے(94)

درج بالا بحث سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد کے جبر و ستم اور حالات کی سنگینی نے معاصر غزل گو شعراء کو مزاحمت پر مجبور کر رکھا ہے۔ جنگیں، دہشت گردی، آمریت، جاگیرداریت اور کارپوریٹ سیکٹر نے انسان کو غیر محفوظ کر دیا ہے اور اس پہ ظلم و ستم کر کے مزاحمت پر اکسا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر غزل گو شعراء مزاحمتی انداز اپناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

1۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱

2۔ احمد نوید، میر، وجود، بالاج پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص ۴۵

3۔ ایضاً، ص ۳۶

4۔ ایضاً، ص ۱۹۰

5۔ احمد نوید، میر، ہاں اور نہیں کے درمیاں، بالاج پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۷

6۔ ایضاً، ص ۱۵۱

7۔ ایضاً، ص ۱۶۴

8۔ احمد نوید، میر، موجود، الاج پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۳

9۔ صابر ظفر، آواز کی لہر پر چلا میں، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۱۹ء، ص ۱۳

10۔ ایضاً، ص ۳۵

11۔ ایضاً، ص ۵۵

12۔ صابر ظفر، دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں، رنگِ ادب پبلی کیشنز، طبع اول ۲۰۲۰ء، ص ۸۵

13۔ ایضاً، ص ۵۴

14۔ صابر ظفر، آتشِ بیگانگی، رب پبلشرز، کراچی، طبع اول ۲۰۲۱ء، ص ۱۰۵

15۔ قمر رضا شہزاد، پیاس بھرا مشکیزہ، وراق پبلی کیشنز، لاہور، طبع چہارم ۲۰۱۷ء ص ۸۹

16۔ ایضاً، ص ۷۰

17۔ ایضاً، ص ۱۱۳

18۔ شبہ طراز، قمر رضا شہزاد کی شاعری کی فکری جہات، (مضمون) مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، شمارہ نمبر 6، بکسن پرنٹر، گلشنِ راوی، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۲۳

19۔ قمر رضا شہزاد، شش جہات، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۲۱ء، ص ۵۲

20۔ قمر رضا شہزاد، خامشی، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۱۹ء، ص ۴۴

21۔ قمر رضا شہزاد، شش جہات، ص ۱۴۷

22۔ اختر عثمان، ابدتاب، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع دوم ۲۰۱۹ء، ص ۸۹

23۔ ایضاً، ص ۵۹

24۔ علی باباتاج، چراغ زار کی جھلملتا میں، (مضمون) مطبوعہ، فانوس، شمارہ نمبر ا، ڈی ایچ پرنٹر، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۵۳

25۔ اختر عثمان، کچھ بچا لائے ہیں، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اول ۲۰۱۹ء، ص ۶۸

26۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، مترجم ظہور الحق، مشمولہ: ادب، فلسفہ اور وجودیت، مرتبہ شمامجید، نعیم الحسن، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۸

27۔ احمد نوید، میر، وجود، ص ۱۸

28۔ ایضاً، ص ۹۳

29۔ ایضاً، ص ۲۰۱

30۔ احمد نوید، میر، موجود، ص ۲۳۴

31۔ ایضاً، ص ۱۸۰

32۔احمد نوید، میر، ہاں اور نہیں کے درمیاں، ص۲۰۶

33۔ایضاً، ص۲۶۱

34۔صابر ظفر، روحِ قدیم کی قسم، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول۲۰۱۸ء، ص۵۴

35۔صابر ظفر، آواز کی لہر پر چلا میں، ص۱۰

36۔ایضاً، ص۱۲۵

37۔صابر ظفر، جمالِ آب سے وصال، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول۲۰۲۰ء، ص۶۰

38۔قمر رضا شہزاد، پیاس بھرا مشکیزہ، ص۹۸

39۔قمر رضا شہزاد، شش جہات، ص۵۸

40۔ایضاً، ص۱۳۳

41۔ایضاً، ص۱۴۴

42۔اختر عثمان، کچھ بچا لائے ہیں، ص۸۵

43۔ایضاً، ص۸۱

44۔ایضاً، ص36

45۔ایضاً، ص۶۴

46۔ایضاً، ص۳۱

47۔احمد نوید، میر، وجود، ص۲۶

48۔ایضاً، ص۲۴۹

49۔احمد نوید،میر،ہاں اور نہیں کے درمیاں،ص۸۵

50۔ایضاً،ص۱۵۰

51۔ایضاً،ص۱۸۹

52۔صابر ظفر،آواز کی لہر پر چلا میں،ص۸۷

53۔کامران نفیس، پانی میں کڑھے رنگ، (مضمون) مطبوعہ روزنامہ جسارت، سنڈے میگزین، کراچی، ۲۵ اکتوبر ۲۰۲۰ء،ص۱۶

54۔صابر ظفر،دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں،ص۳۳

55۔ایضاً،ص۱۱۶

56۔صابر ظفر،روحِ قدیم کی قسم،ص۵۳

57۔صابر ظفر،آتشِ بیگانگی،ص۵۶

58۔ایضاً،ص۱۸

59۔قمر رضا شہزاد، شش جہات،ص۵۳

60۔ایضاً،ص۱۳۶

61۔وحید احمد،ڈاکٹر،(فلیپ) یاد دہانی،از قمر رضا شہزاد،شرکت پرنٹنگ پریس، طبع دوم ۲۰۱۹ء

62۔قمر رضا شہزاد، شش جہات،ص۱۳۷

63۔قمر رضا شہزاد،پیاس بھرا مشکیزہ،ص۱۲۸

64۔اختر عثمان،کچھ بچا لائے ہیں،ص۱۲

65۔ایضاً،ص۲۵

66۔ ایضا، ص۴۹

67۔ ایضاً، ص۵۹

68۔ اختر عثمان، چراغ زار، ص۵۸

69۔ کامیو، البرٹ، جدید اردو نظم میں وجودیت، از شاہین مفتی، ڈاکٹر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸، ص25

70۔ میر احمد نوید، وجود، ص۲۵۱

71۔ ایضاً، ص۲۵۰

72۔ ایضاً، ص۱۸۸

73۔ احمد نوید، میر، ہاں اور نہیں کے درمیاں، ص۸۸

74۔ احمد نوید، میر، موجود، ص۷

75۔ کامران نفیس، پانی میں کڑھے رنگ، (مضمون) مطبوعہ روزنامہ جسارت، سنڈے میگزین، کراچی، ۲۵ اکتوبر ۲۰۲۰ء، ص۱۶

76۔ صابر ظفر، جمالِ آب سے وصال، ص۱۰۵

77۔ ایضاً، ص۷۶

78۔ صابر ظفر، روحِ قدیم کی قسم، ص۱۹

79۔ ایضاً، ص۳۱

80۔ صابر ظفر، دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں، ص۵۰

81۔ صابر ظفر، آتشِ بیگانگی، ص۴۴

82۔ ایضاً، ص ۴۷

83۔ قمر رضا شہزاد، شش جہات، ص ۱۰۹

84۔ قمر رضا شہزاد، خامشی، ص ۱۱۰

85۔ شازیہ رباب، قمر رضا شہزاد کا کلیات، "خاک زار"، (مضمون) مطبوعہ: روزنامہ جنگ، قرطاسِ ادب، ملتان، ۲۵ اپریل ۲۰۲۲ء، ص ۱

86۔ ایضاً، ص ۱۲۶

87۔ قمر رضا شہزاد، ہارا ہوا عشق، ص ۳۷

88۔ قمر رضا شہزاد، پیاس بھرا مشکیزہ، ص ۷۹

89۔ اختر عثمان، کچھ بچا لائے ہیں، ص ۴۸

90۔ اختر عثمان، ابد تاب، ص ۱۲

91۔ ایضاً، ص ۲۹

92۔ اختر عثمان، چراغ زار، ص ۵۱

93۔ حسین محمود، اختر عثمان کا شعری لحن 'چراغ زار' کے تناظر میں، (مضمون)، مشمولہ، خیابان، شمارہ ۴۲، شعبہ اردو جامعہ پشاور، پشاور، ۲۰۲۱ء، ص ۱۴۹

94۔ ایضاً، ص ۸۷

باب چہارم: مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات

الف: مجموعی جائزہ

مغربی فلسفیانہ تحریک وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے تصور کو معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں پر کھا گیا ہے۔ وجودیت کی تحریک بنیادی طور پر فرد کو در پیش مسائل کے متعلق بحث کرتی ہے اور انسانی وجود کو اہم قرار دیتی ہے۔ فلسفۂ وجودیت کو دو دبستانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک الہیاتی دبستانِ وجودیت اور دوسرا الحادی دبستانِ وجودیت۔ الہیاتی وجودی وجودیت کی صوفیانہ تعبیر اپناتے ہیں ان کے نزدیک فرد اپنے بوجھ کو تقدیر یا خدا پہ ڈال کے مطمئن ہو جاتا ہے لیکن الحادی وجودیوں بالخصوص سارتر وجود کو جوہر پر مقدم قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک انسان نے اپنا بوجھ خود اٹھانا ہے۔ وہ اس دنیا میں پھینکا گیا ہے اور اس نے اپنی دنیا آپ بنانی ہے اور وجود کو در پیش مسائل کو خود حل کرنا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے۔ اس لیے انسان اپنے اعمال وافعال کا خود ذمہ دار ہے۔ وجودیت کی مذہبی اور صوفیانہ تعبیر کرنے والے وجودی مفکرین کے مقابلے میں الحادیوں کا طریق زیادہ مشکل اور پریشان کن ہے جس میں انسان ہی مرکز و محور ہے اور اس نے اپنا بوجھ اٹھانا ہے۔

وجودیت کے مباحث کا زیادہ تر انحصار ژاں پال سارتر کے خطبے پر کیا گیا ہے۔ جس میں انسان دوستی اور فرد کی آزادی وجودیت کے اہم موضوعات ہیں۔ اسی فرد کی آزادی کے تصور کو معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں دیکھا گیا ہے۔ وجودی مفکرین کے مطابق فرد کی آزادی بے پناہ اہمیت کی حامل ہے انسان جب تک اپنے فیصلوں، انتخاب اور آزادیِ فکر و عمل حاصل نہیں کرتا تب تک اپنے وجود کی تعمیر و تشکیل نہیں کر سکتا۔ وجودیت کی تحریک کے شروع ہونے کے جو محرکات تھے کم و بیش ویسے ہی حالات ہمارے شعراء کو بھی در پیش رہے جس کی بنا پر ان کے ہاں وجودیت کا تصور در آیا۔

برصغیر پاک وہند کے خونی حالات، غلامی، انگریزوں اور جاگیرداروں کی اجارہ داری، سرمایہ داری اور صنعتی انقلاب جیسے حالات سے گزر کر معاملہ تقسیم ہند تک پہنچتا ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد فرد کے مسائل حل ہونے کی بجائے اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ہمسایہ ملک دشمن بن جاتا ہے، اوپر تلے چار جنگیں، افغان جنگ، دہشت گردی، ڈرون حملے، نام نہاد جمہوریت، آمرانہ طرزِ حکومت، جاگیرداروں کی اجارہ داری، صنعتی، سائنسی اور تکنیکی انقلاب کے اثرات اور کارپوریٹ

سیکٹرز جیسے ظالمانہ و جابرانہ ادارے جب فرد کو غیر محفوظ بنانے لگے اور اس کے لیے مسائل کے پہاڑ کھڑے کرنے لگے، آزادی اظہار پر پابندی لگی، زبانیں بند کر دی گئیں اور آزادی کا تصور معدوم ہونے لگا تو یہاں ردِ عمل آیا، مزاحمتی رویے پروان چڑھے، انسانی آزادی اور انسانی وجود کو لے کر مباحث ہونے لگے اور وجودیت کے تحریک زور پکڑنے لگی جس سے معاصر اردو غزل کو شعراء متاثر ہوئے۔

عہدِ حاضر کے متعدد شعراء کے ہاں وجودیت کے عناصر موجود ہیں اور فرد کی آزادی کے تصور کے مختلف پہلو دریافت کرنے کے لائق ہیں کچھ شعراء کا سرسری تعارف کروانے کے بعد چار معاصر غزل گو شعراء کو منتخب کیا گیا ہے جن کے کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ ان میں میر احمد نوید، صابر ظفر، قمر رضا شہزاد اور اختر عثمان شامل ہیں۔ مقالے کا دوسرا باب انھی چار شعراء کے کلام کو لے کر آگے بڑھتا ہے اور ان کے کلام سے آزادیِ انتخاب اور سوچ کے عناصر دریافت کیے جاتے ہیں۔ معاصر شعراء سمجھتے ہیں فرد کو آزاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے فیصلے خود کرے اور اپنے لیے آزادی سے انتخاب کر سکے۔ خود مختار رہے۔ یہاں مذہبی اور الحادی دونوں طرح کے نظریات سامنے آتے ہیں ہمارے شعراء مذہبی نقطہ نظر رکھنے کے باوجود کہیں کہیں تخیل کے ایسے مدار میں چلے جاتے ہیں جہاں مغائرت و تشکیک کے علاوہ انکار تک کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ خاص کر میر احمد نوید انسان کی خود مختاری کے قائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو اپنے فیصلے آپ کرنے ہیں۔ اگلے مرحلے میں فرد بحیثیتِ قانون ساز اور ماورائیت کے مرکز کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہاں فرد کو مرکزیت حاصل ہے۔ جب انسان اپنے وجود سے بلند ہو جاتا ہے تو وہ ماورائیت کا مرکز بن جاتا ہے وہ قانون سازی کرتا ہے۔ نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی فیصلے کرتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ زیرِ بحث آتا ہے کہ فرد کو اپنے فیصلے لیتے ہوئے دوسروں کا خیال بھی رکھنا ہے اور اسے اپنے فیصلوں کی ذمہ داری آپ اٹھانی ہے۔ معاصر اردو غزل گو شعراء فرد کی انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج پر زور دیتے ہیں۔ فرد کو اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اجتماعیت کا حصہ بننا ہے اور اجتماع کا خیال رکھنا ہے۔

وجودی فلاسفہ کے نزدیک فرد اپنے خارج میں ہے لیکن وجودی اس سے بحث بھی کرتے ہیں کہ داخلی کائنات بھی ہے اور باطن کے اہمیت بھی ہے۔ واقعیت، عینیت، مظہریت، اضطراب، کرب، اندوہ ناکی، خوف، دہشت اور مایوسی سب

وجودیت ہی کی اصطلاحات ہیں۔ جنھیں خارج کے ساتھ ساتھ باطن سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ یہاں لغویت، عدمیت، اور لایعنیت بھی زیرِ بحث آتی ہیں۔

مقالے کا تیسرا باب فرد کی آزادی اور آزادیِ عمل کے متعلق بحث کرتا ہے۔ وجودی فلاسفہ کے مطابق فرد کا فیصلہ اور اس کا انتخاب اس کے عمل سے مشروط ہیں۔ اگر وہ سوچنے اور انتخاب کرنے میں آزاد ہے لیکن وہ اپنے فیصلے اپنی فکر اور اپنے انتخاب کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تو اس کی آزادی کا تصور مکمل اور واضح نہیں ہو سکتا۔

معاصر غزل کے منتخب شدہ چاروں شعراء کے ہاں آزادیِ عمل کے نظریات بھر پور انداز میں موجود ہیں۔ وہ فرد کے نجی ایجاب وارتکاب میں اس کی آزادی کے خواہاں ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ فرد کو اپنے فیصلوں اور اپنی فکر کی آزادی کی طرح آزادیِ عمل بھی حاصل ہو۔ ساتھ ہی فلسفۂ عمل کو احساسِ ذمہ داری سے مشروط کیا جاتا ہے کہ آپ کو اپنے اعمال وافعال کو بوجھ از خود اٹھانا ہے۔ آپ خدا یا تقدیر پہ بوجھ نہیں ڈال سکتے۔ الحادیوں کے ہاں تو خدا کا تصور ہی نہیں تو فرد ہی کو ذمہ داری اٹھانی ہے کیوں کہ خدا تو موجود ہی نہیں۔ انسان خدا کی جگہ لے چکا ہے۔

معاصر غزل گو شعراء وجود اور جوہر دونوں کی اہمیت کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو وجود کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوں اور نہ ہی ایسے اشعار کی کمی جو جوہر کی اہمیت کے متعلق ہوں۔ یہاں سارتر کے فلسفے کے تناظر میں وجود کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اعلیٰ مقاصد کی جستجو وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے کیوں کہ فرد زیادہ تر عمل کی آزادی چاہتا ہی اسی لیے ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد حاصل کر سکے۔ فرد کی آزادی کے باب میں مزاحمت کو الگ سے معاصر غزل گو شعراء کے ہاں دیکھا گیا ہے۔ جب فرد کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور جبر کی انتہا کر دی جاتی ہے تو پھر مزاحمت ہی آزادی کا پہلا زینہ ہوتی ہے۔ منتخب معاصر غزل گو شعراء کے ہاں خاصی تعداد میں مزاحمتی عناصر موجود ہیں۔۔ خاص کر صابر ظفر کا کلام مزاحمت سے بھرا پڑا ہے۔ انھیں اپنے ہی پاسبانوں سے خطرہ ہے جس کا اعلان وہ بار بار کرتے ہیں۔ میر احمد نوید اور قمر رضا شہزاد کے ہاں بھی مزاحمتی عناصر خاصی مقدار میں موجود ہیں۔ اختر عثمان کے ہاں شعری جمالیات کا غلبہ ہے اور مزاحمت کے اشعار دیگر شعراء کی نسبت کم ملتے ہیں لیکن اس قدر ضرور ہیں کہ مقالے کا حصہ بن سکیں۔ احتیاط کا درس دیتے ہیں کہ اس کرگسوں کے غول میں گھرے استخوان اور صحرا سے بچا جائے یہاں تو کھال تک نہیں ملے گی۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں وجودیت کے تناظر میں فرد کی آزادی کے تصورات موجود ہیں۔ معاصر شعراء فرد کو اپنی فکر، اپنے فیصلوں اپنے انتخاب و عمل میں آزاد دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ان کے نزدیک فرد خود مختار ہے۔اسے مرکزیت حاصل ہے اور اس کے باطن کی اہمیت ہے جس کا خیال رکھا جانا لازم ہے۔ وہ سمجھتے ہیں فرد کو آزادیِ عمل حاصل ہو۔ فرد نجی ایجاب و ارتکاب میں آزاد ہو۔ وجود کو جوہر پر مقدم جانا جائے اور فلسفہِ عمل کے ساتھ ساتھ ذمہ داری بھی قبول کی جائے۔اعلیٰ مقاصد کی جستجو ہو اور جبر کے خلاف مزاحمت ہو۔ ترقی پسند تحریک کے شعراء کے ہاں اول اول جو وجودیت کے نقوش کی جھلک دکھائی دیتی تھی وہ معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔

ب: تحقیقی نتائج

تحقیقی مقالے کی تکمیل کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مغربی فلسفیانہ تحریک وجودیت میں فرد کی آزادی کو بنیادی اور اہم ترین حیثیت حاصل ہے۔اور اس کے اثرات ہمارے معاشرے تک پہنچ چکے ہیں۔ منتخب معاصر اردو غزل گو شعراء کے ہاں ایسے نظریات وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ بالخصوص فرد کی آزادی کا تصور تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

منتخب معاصر غزل گو شعرا کے ہاں مذہبی اور الحادی دونوں طرز کے تصورات ملتے ہیں۔ شعراء مذہبی اور صوفیانہ تعبیر سے کام لیتے ہیں لیکن بحیثیتِ شاعر بسا اوقات ان کے تخیل کی پرواز مذہبی مداروں سے نکل کر تشکیک اور انکار تک جا پہنچتی ہے۔ جہاں وہ خدا کے ہونے اور نہ ہونے پر سوال اٹھاتے ہیں اور بعض اوقات اس کا انکار کر کے انسانی وجود کو ماورائیت کا مرکز قرار دیتے ہیں جہاں انسان قانون ساز بن جاتا ہے اور اپنے فیصلے آپ کرتا ہے اور ان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ میر احمد نوید کا شمار ایسے شعراء میں ہوتا ہے جن کا جھکاؤ الحادی دبستانِ وجودیت کی طرف زیادہ ہے۔

وجودیت کے تناظر میں معاصر غزل گو شعرا کے ہاں آزادی کے تصور کے حوالے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ منتخب شعراء فرد کی سوچ، فکر، انتخاب، فیصلے اور عمل میں آزادی کے خواہاں ہیں۔ وہ فرد کو خود مختار دیکھنا چاہتے ہیں کہ آزادیِ انتخاب و آزادیِ عمل کے ساتھ ساتھ خود مختاری وجودیت کا بنیادی مقصد اور نظریہ ہے۔ معاصر شعراء فرد کو بحیثیتِ قانون ساز دیکھتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ فرد ماورائیت کا مرکز ہے وہ خود سے اوپر اٹھ کر ماورائیت کا مرکز بنتا ہے۔ جہاں وہ

اپنے لیے اور دوسروں کے لیے قانون سازی کرتا ہے۔ معاصر غزل گو شعراء فرد کو اس کی انفرادیت قائم کرنے کے قائل ہیں۔ معاصر شعراء فرد کی انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج کو بھی اہمیت دیتے ہیں کہ فرد نے تنہا نہیں بلکہ اجتماع کا حصہ بن کر رہنا ہے۔

منتخب معاصر غزل گو شعراء فرد کی داخلی کائنات اور باطن کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ منتخب معاصر غزل گو شعراء فرد کی آزادی اور آزادیِ عمل کے ساتھ ساتھ فرد کے نجی ایجاب وارتکاب کے حوالے سے بھی زور دیتے ہیں کہ فرد کو اجتماعی اور نجی زندگی میں مکمل خود مختاری اور آزادی حاصل ہو۔ معاصر غزل گو شعراء کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو وجود کو جوہر پر مقدم جانتے ہوں۔ فلسفہِ عمل اور ذمہ داری کے نظریات بھی معاصر شعراء کے کلام کا حصہ ہیں۔ احساسِ ذمہ داری عمل سے مشروط ہے فرد کو اپنے فیصلے کرتے ہوئے دوسروں کا خیال بھی رکھنا ہے اور اپنے افعال واعمال کی ذمہ داری بھی اٹھانی ہے۔

اعلیٰ مقاصد کی جستجو منتخب معاصر شعراء کے کلام کا ایک اہم حصہ ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش فرد کے لیے بہت ضروری ہے۔ جب معاشرتی اور سماجی جبر فرد سے اس کی آزادی چھین لیتا ہے تو ایسے میں مزاحمت کا راستہ اپنایا جاتا ہے۔ معاصر غزل گو شعراء کے ہاں مزاحمتی عناصر بہ درجہِ اتم موجود ہیں۔ وہ نظام کی سختیوں اور بندشوں کے خلاف سراپا احتجاج دکھائی دیتے ہیں۔

فرد کی آزادی پر منتخب معاصر شعرا بھرپور زور دیتے ہیں بالخصوص میر احمد نوید انسان کی خود مختاری کے قائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو اپنے فیصلے آپ کرنے ہیں۔ اگلے مرحلے میں فرد بحیثیتِ قانون ساز اور ماورائیت کے مرکز کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہاں فرد کو مرکزیت حاصل ہے۔ جب انسان اپنے وجود سے بلند ہو جاتا ہے تو وہ ماورائیت کا مرکز بن جاتا ہے وہ قانون سازی کرتا ہے۔ آزادی اور مزاحمت ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ معاصر غزل گو شعراء کے ہاں خاصی تعداد میں مزاحمتی عناصر موجود ہیں۔ خاص کر صابر ظفر کا کلام مزاحمت سے بھرا پڑا ہے۔ انھیں اپنے ہی پاسبانوں سے خطرہ ہے جس کا اعلان وہ بار بار کرتے ہیں۔ قمر رضا شہزاد کے ہاں فرد کی آزادی کے تمام تر لوازمات پورے ہیں بالخصوص فلسفہ عمل اور ذمہ داری کی کلی صورتیں موجود ہیں۔ قمر رضا شہزاد کے ہاں ہمدردی، انسانیت اور محبت کے جذبات ملتے ہیں۔ یہاں سارتر کے نظریات کی مزید توسیع ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ سارتر جب کہتا ہے کہ فرد آزاد ہے اور وہ انسان

دوست ہے اسے اپنے فیصلوں اور اعمال کی ذمہ داری اٹھانی ہے اور دوسروں کا خیال رکھتے ہوئے فیصلے کرنے ہیں تو یہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ محبت اور ہمدردی کے جذبات ہی وہ طاقت ہیں جو فرد کی آزادی کو بے لگامی کی حد تک نہیں جانے دیتے وہ دوسروں کا بھی خیال رکھتا ہے اور اپنی آزادی کا بھرم بھی رکھتا ہے۔اختر عثمان کے ہاں فرد کی آزادی تمام تر شعری جمالیات کے ساتھ موجود ہے۔ان کے نزدیک انسان اعلیٰ وارفع مقام رکھتا ہے اور وہ یہ مقام اپنے فیصلوں اور ارادوں سے حاصل کرتا ہے ان کے نزدیک اعلیٰ مقاصد کی جستجو انسانی وقار میں اضافے کا باعث ہے۔وہ فرد کو مرکز و محور سمجھتے ہیں۔ اختر عثمان کے ہاں ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ غالب ہے وہ خود دکھ درد سہہ کر دوسروں کو آفات و تکالیف سے بچانا چاہتے ہیں۔فرد کی آزادی کے تصور کو وسعت عطا کریں تو دوسرے انسانوں کا خیال رکھنا اور خود دکھ سہنا انسان کے وقار کے مطابق ہے اور اس کی آزادی کے اختیار کو عزت بخشتا ہے۔

ہمارے ہاں وجودیت کے نظریات کے پروان چڑھنے اور اس کے محرکات کا پتہ چلانے پر معلوم ہوتا ہے کہ کارپوریٹ سیکٹر کی شاطرانہ چالیں اور افراد کے ساتھ ناانصافی، آمرانہ طرزِ حکومت، جاگیریت اور سرمایہ داریت کے جال ایسے عوامل ہیں جو فرد کی آزادی چھینتے ہیں اور اسے بنیادی ضرورتوں سے محروم کرتے ہیں۔معاصر شعراء ان تمام عناصر کے خلاف بر سر پیکار دکھائی دیتے ہیں اور پر اثر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

ج: سفارشات

۱۔ فرد کی آزادی کے تصور سے ہٹ کر وجودیت کے مختلف پہلوؤں پر الگ سے کام کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ " نئی وجودیت "۔معاصر اردو غزل گو شعراء اور ادبا کے فن پاروں کو نئی وجودیت کے تناظر میں پرکھا جائے جیسا کہ کولن ولسن نے کہا ہے کہ سارتر جس مطلق آزادی کا بار بار ذکر کرتا ہے آخر وہ اس آزادی کا کیا کرے گا جب کہ دنیا لغو اور لایعنی ہے۔

۲۔یورپ کی طرح ہمارے ہاں بھی وجودیت کی ایک صوفیانہ تعبیر ہے اور ایک الحادی تعبیر ہے۔دونوں دبستانوں کا الگ الگ مطالعہ کرنے اور دونوں کا موازنہ کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہمارے ہاں وجودیت کے غالب رجحان کا پتہ چلے گا۔

۳۔ دورانِ تحقیق وجودیت کے تناظر میں تشکیک و مغائرت کے عناصر معاصر شعراء کے ہاں وافر مقدار میں دیکھنے کو ملے ہیں۔ ہمارے عہد کے حالات اور شعراء کے کلام کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے تاکہ مغائرت، تشکیک، انکار اور آگے چل کر خودکشی وغیرہ کے عناصر کا بہ خوبی جائزہ لیا جاسکے۔

۴۔ صابر ظفر کے ہاں مزاحمت پر بے تحاشا مواد موجود ہے۔ صابر ظفر کے ہاں مزاحمتی عناصر اور اسباب کے حوالے سے بھرپور تحقیقی مقالے کی گنجائش موجود ہے۔

۵۔ میر احمد نوید کے ہاں تشکیک، مغائرت اور انکار کے عناصر بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان عناصر کی نوعیت، محرکات اور اسباب کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۶۔ قمر رضا شہزاد کے کلام کو اس نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس کس زاویے اور کس کس پہلو سے اپنے وجود کی تعمیر و تشکیل چاہتے ہیں یا انسان اپنے وجود کی تعمیر کیسے کر سکتا ہے۔

۷۔ اختر عثمان کے کلام کو وجودیت کے علاوہ جمالیاتی اور مذہبی عناصر کے حوالے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات

1۔احمد نوید، میر، وجود، بالاج پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء

2۔احمد نوید، میر، موجود، بالاج پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء

3۔احمد نوید، میر، ہاں اور نہیں کے درمیاں، بالاج پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء

4۔اختر عثمان، کچھ بچا لائے ہیں، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اول ۲۰۱۹ء،

5۔اختر عثمان، چراغ زار، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع دوم ۲۰۱۹ء

6۔اختر عثمان، ابدتاب، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع دوم ۲۰۱۹ء

7۔صابر ظفر، روحِ قدیم کی قسم، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۱۸ء

8۔صابر ظفر، آواز کی لہر پہ چلا میں، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۱۹ء

9۔صابر ظفر، دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۲۰ء

10۔صابر ظفر، جمالِ آب سے وصال، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۲۰ء

11۔صابر ظفر، آتشِ بیگانگی، رب پبلشرز، کراچی، طبع اول ۲۰۲۱ء

12۔قمر رضا شہزاد، پیاس بھرا مشکیزہ، وراق پبلی کیشنز، لاہور، طبع چہارم ۲۰۱۷ء

13۔قمر رضا شہزاد، ہارا ہوا عشق، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع سوم ۲۰۱۷ء

14۔قمر رضا شہزاد، یاددہانی، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع دوم ۲۰۱۹ء

15۔قمر رضا شہزاد، خامشی، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۱۹ء

16۔ قمر رضا شہزاد، بارگاہ، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۲۰ء

17۔ قمر رضا شہزاد، شش جہات، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۲۱ء

ثانوی ماخذات

1۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، مرتب، غزل آباد، قدوسیہ اسلامک پریس، لاہور، طبع اول ۲۰۰۶ء

2۔ افتخار عارف، حرفِ باریاب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اول ۱۹۹۴ء

3۔ افضال نوید، مجھ پر وجود آیا ہوا، بک ہوم، لاہور، طبع اول ۲۰۱۹ء

4۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، مابعد جدیدیت فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، طبع اول ۲۰۱۳ء

5۔ جاوید احمد، مٹی کا شجر، ایسٹرن پبلشرز، لاہور، طبع اول ۲۰۱۶ء

6۔ جاوید اقبال، مرتب، وجودیت، وکٹری بک بینک، ساہیوال، طبع اول ۱۹۸۹ء

7۔ جاوید، قاضی، وجودیت، فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور، طبع اول ۱۹۹۸ء

8۔ جلیل عالی، عرضِ ہنر سے آگے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، طبع اول ۲۰۰۷ء

9۔ جمیل اختر محبی، ڈاکٹر، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اول ۲۰۰۲ء

10۔ حیات عامر حسینی، ڈاکٹر، وجودیت، بتول پبلی کیشنز، سری نگر، طبع دوم ۱۹۹۱ء

11۔ دلاور علی آذر، ماخذ، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، طبع اول ۲۰۱۶ء

12۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، مترجم: قاضی جاوید، مشعل گارڈن ٹاؤن، لاہور، س ن

13۔ سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اردو اکادمی، اترپردیش، لکھنو، طبع اول ۱۹۷۸ء

14۔ شاہین عباس، خدا کے دن، کاغذی پیرہن، لاہور، طبع اول ۲۰۰۹ء

15۔ شیما مجید، نعیم احسن، مرتبین، ادب، فلسفہ اور وجودیت، نگارشات، لاہور، طبع اول ۱۹۹۲ء

16۔ صابر ظفر، پلکوں میں پروئی ہوئی رات، خرم پرنٹنگ پریس، کراچی، طبع اول ۲۰۱۲ء

17۔ طارق ہاشمی، جدید غزل کا باب ظفر، رنگ ادب، پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول ۲۰۱۵ء

18۔ ظفر اقبال، آبِ رواں، شاہی پریس، لکھنو، طبع اول ۱۹۷۸ء

19۔ عابد سیال، بے ستوں، پریمئیر پریس، راولپنڈی، طبع اول ۲۰۱۴ء

20۔ عباس تابش، عشق آباد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول ۲۰۱۱ء

21۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ فلسفہ، خرد افروز، جہلم، ۱۹۹۲ء

22۔ کشور ناہید، آباد خرابہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع اول ۲۰۱۶ء

رسائل و جرائد

1۔ ارژنگ، شمارہ نمبر ۱۱، راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، لاہور، ۲۰۲۱ء

2۔ تخلیق، شمارہ نمبر ۶، بکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور، ۲۰۲۰ء

3۔ تخلیق، شمارہ نمبر ۹، بکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور، ۲۰۲۱ء

4۔ جسارت، سنڈے میگزین، کراچی، ۲۵ اکتوبر ۲۰۲۰ء

5۔ جنگ، قرطاس ادب، ملتان، ۲۵ اپریل ۲۰۲۲ء

6۔ خیابان، شمارہ ۴۲، شعبہ اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۲۱ء

7۔فانوس، شمارہ نمبر ا، ڈی ایچ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۸

غیر مطبوعہ مقالہ جات

1۔افتخار بیگ، مجید امجد کی شاعری اور فلسفہِ وجودیت مقالہ برائے ایم-فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

2۔شاہین مفتی، ڈاکٹر، جدید اردو نظم میں وجودیت، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاؤالدین زکریا، یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸ء